رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہی مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا جا رہا ہے،

اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیلِ دین، تاسیسِ حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائصِ نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کیگئی ہو کہ اُنمیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے صحیح عقائد لکھے جائیں،

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور اُن کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں تے، تقطیع خورد، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، للعہ، تقطیع خورد صعہ، صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں سے، سے، تقطیع خورد صعہ، دعہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ، للعہ مر،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ٣٩	ماہ ربیع الاول سنہ ١٣٥٦ھ مطابق ماہ جون سنہ ١٩٣٧ء	عدد ٦

مضامین

شذرات

۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء کو کلکتہ سے ایسوسی ایٹڈ پریس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ایک عجیب و غریب عربی کتاب کے واحد نسخہ کے وجود کی خبر دی ہے، جس کا پتہ شمس العلماء ہدایت حسین صاحب نے لگایا ہے، اس کتاب کی صنعت یہ ہے کہ چند جدولون میں الفاظ لکھے ہوئے ہین، اگر ایک جدول کے الفاظ داہنے سے بائین پڑھیے تو ایک خاص علم کی کتاب ہوجائے گی، اگر اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرے فن کی کتاب ہوگی، اگر ایک جدول کے الفاظ چھوڑ کر پڑھئے تو تیسرے فن کی کتاب ہوجائیگی، یہ بھی خبر ہے کہ فاضل موصوف کتاب کے اس یگانہ نسخہ پر کوئی تحقیقی مضمون کلکتہ مین پڑھین گے،

اس سلسلہ میں یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ اس کتاب کے قلمی نسخے جابجا ملتے ہیں، ابھی اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ مین دیکھا ہے، اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ یہ پرانے زمانہ میں ہندوستان مین عنوان الشرف کے نام سے چھپ بھی چکی ہے، اور اس کا مطبوعہ نسخہ دلیسنہ لائبریری (ضلع پٹنہ) مین موجود ہے،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں "ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے جو تقریر کی گئی تھی وہ اخباروں میں شائع ہوچکی ہے، اس تقریر میں دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی اس عام اور مشترک زبان کا موزون نام "ہندوستانی" ہے، جو اس زبان کے مختلف پرانے ناموں میں سے ایک مشہور نام ہے، جہاں تک اخباروں کی تحریروں اور اشخاص کی اطلاعون اور گفتگوون کا تعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

اس تجویز کے ہمدردوں اور معاونوں کی خاصی کثرت ہے، یہ تقریر مستقل رسالہ کی صورت میں الگ بھی چھپ چکی ہے، جن صاحب کو ضرورت ہو وہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر دفتر دار المصنفین سے منگوا سکتے ہیں،

ہندوستان میں بہار پہلا صوبہ ہے، جہاں ایک انگریز حاکم کی بد دماغی اور جہالت سے ہندوستانی رسم الخط عدالتوں سے برطرف ہوکر ہندی رسم الخط حکماً جاری کیا گیا تھا، اور تقریباً باون برس تک یک لخت ہندوستانی رسم الخط یہاں قانوناً ممنوع رہا، ہندوستانی زبان جاننے والے جنمین مسلمانون کی اکثریت تھی، اس سے سخت تکلیف مین مبتلا رہے، ان کو عدالت کے ہر حکم اور نوشتہ سے واقفیت کے لئے ایک ہندی داں کی تلاش ناگزیر ہوتی تھی، یہی حاکم جب بدل کر صوبہائے متحدہ میں گئے تو وہان بھی انھون نے اردو و ہندی کے جھگڑے کا بیج بویا،

بہار کے ہندوستانی جاننے والے اور خاص طور سے مسلمان ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ ممانعت کسی طرح دور ہو اور ان کو بھی اپنے رسم خط میں لکھنے کی اجازت مل جائے، آخر نصف صدی کے بعد چند سال ہوے کہ بڑی کوششوں کے بعد صرف پٹنہ کمشنری کے لئے یہ اجازت حاصل ہوسکی، اب نئے آئین کے تحت مین اس صوبہ میں جو وزارت قائم ہوئی ہے اس نے پورے صوبہ میں نہ صرف ہندوستانی رسم خط کی اجازت دیدی ہے، بلکہ یہ لازمی کر دیا ہے کہ ہر عدالتی کاغذ مین ایک ہی عبارت دونوں رسم خط میں لکھی جایا کرے کہ تاکہ دونوں میں ایک جاننے والے بھی سرکاری حکم سے آسانی کے ساتھ باخبر ہوسکین، امید ہے کہ اس تجویز کو دوسرے صوبوں میں بھی قبول کیا جائے گا، تاکہ ہر خط کے جاننے والوں کو یکساں آرام پہنچے،

ہم لوگ ابھی تک اردو اور ہندی کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں، اس سلسلہ میں پٹنہ ہائیکورٹ کا ایک فیصلہ ذکر کے قابل ہے، تاکہ دوسرے صوبوں میں بھی وہ نظیر کا کام دے، پٹنہ ہائیکورٹ نے چند سال ہوے یہ فیصلہ

صادر کیا ہے کہ پٹنہ ہائیکورٹ کی زبان "ہندوستانی" ہے، اور ہندوستانی کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ زبان جو عام طور سے یہاں بولی جاتی ہے، اور جو یہاں کی عدالتوں میں اب تک مروج ہے، یہ فیصلہ بالکل بجا اور درست ہے،

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی زبان و ادب کے ایم اے کے درجے جب سے کھلے ہیں، انگریزی تعلیم یافتوں کو اپنی زبان سے جو بیگانگی تھی وہ نسبتہً کم ہو رہی ہے، اور اس زبان کے طالب علموں کی تعداد سال بسال بڑھ رہی ہے، ہم کو ایک یونیورسٹی کا حال معلوم ہے، جہاں پچھلے سال "گیارہ" طالب علم تھے، اور امسال چھبیس تھے، اور ان کی واقفیت کا معیار بھی ہر سال بڑھ رہا ہے،

لیکن یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ وہی شہر آگرہ، لکھنؤ، دہلی جو ہندوستانی زبان کے مرکز ہیں اس زبان کی علمی تعلیم و سند سے محروم ہیں، شیراز کے پیر دانا کا یہ شکوہ شاید ہمیں کے حسب حال ہو،

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

مقالات

خطبۂ صدارت

شعبۂ علوم و فنونِ اسلامی،

جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر ۲۷ مارچ ۳۶ء کو بمقام اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قدر شناسانِ علم و فن!

ممنون ہوں کہ علماء اور اہلِ علم کی اس مجلس میں اس کرسی پر بٹھا کر آپ نے علم و فن کے ایک خدمت گار کی عزت اور آبرو بڑھائی،

اسلامی علوم و فنون کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر علم و ہنر کے چند قیمتی موتیوں کو نکال کر قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا میرے جیسے سست بازو کا کام نہیں، بہر حال مجھے آپ کے سامنے نذرانہ کیلئے کچھ پیش کرنا ہے، وہ درِ شہوار ہوں یا خزفِ بازارہ،

سب سے پہلے تو ہم کو اس خوشی کا اظہار کرنا ہے، کہ مدت کے بعد ہمکو اپنی بھولی ہوئی دولت یاد آئی، ورنہ زمانہ کے انقلاب سے یورپ کے نئے علوم و فنون نے ہماری آنکھوں میں وہ خیرگی پیدا کر دی تھی، کہ ہمارا اپنا مطلعِ انوار ہماری نگاہوں سے چھپ گیا تھا، علم و فن کسی قوم کی ایسی وراثت نہیں، جو کبھی چھن نہ سکے، مختلف قوموں نے باری باری سے علم و فن کی خدمت کی ہے، اور جب اسکی ہمت ہار گئی، تو دوسری باہمت قوم نے آگے بڑھکر اس فرض کو ادا کیا، اسی طرح دنیا کے آغاز سے آجتک یہ دولت بڑھتی ہی رہی ہے، گھٹی نہیں، انسانی خزانوں کے گھر بدلے ہیں، کمائی ہوئی مقدار کبھی ہاتھ سے نہیں گنوائی ہے،

سب جانتے ہیں کہ مذہبی علوم کے علاوہ دوسرے ادبی اور عقلی علوم مسلمانوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے، اور اپنے عروج کے دور میں ان کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا، پھر زمانہ نے پلٹا کھایا، اور یہیں اور پستی کی راہ سے علم و فن کے مسافر نے یورپ کے ظلمتکدہ میں قدم رکھا، اور اپنی تیز مشعل سے اس گھر کو روشن کر گیا،

مسلمانوں کو یہ فخر ہے، کہ انھوں نے اپنے دینی علوم کی جس طرح ترتیب و تدوین کی کلیات بنائے اصول وضع کئے، جزئیات اور فروع کی تفصیل کی اور انہیں سے ہر صنف پر تصنیفات کا ڈھیر جس طرح لگا دیا وہ مذہبی قوموں کی تاریخ میں بے نظیر کارنامہ ہے، اسلام کے معلم اور ہادی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیرووں کے ہاتھوں میں قرآن نام ایک کتاب دی تھی، اور یہی اسلام کے کتبخانے کی سب سے پہلی کتاب ہے، یہ کتاب تبیاناً لکل شیئ تھی، اس تبیان کی تفصیل ہمارے وہ سارے دینی علوم ہیں، جو اب ہمارے کتبخانوں کی زینت اور ہمارے مذہبی مدرسوں کے نصاب درس ہیں،

غور کرنے والوں کو یہ نظر آئے گا کہ ہر قوم کے سامنے ایک مرکزی تخیل رہتا ہے، جو اس کے ہر علم و فن اور شعر و ادب کا مرکز ہوتا ہے، مسلمان قوموں کا یہ تخیل ان کا قرآن ہے، انھوں نے جس علم و فن کی خدمت کی اسکی تحریک کا جذبۂ شوق دراصل قرآن پاک ہی کے کسی جز کی خدمت کا ذوق اور جوش تھا، قرآن پاک کی آیتوں کی تشریح کی گئی تو علم تفسیر بن گیا، حامل قرآن کی قولی اور عملی تشریحوں کو جمع کیا گیا، تو علم حدیث پیدا ہوگیا، قرآن کے اعتقادی تعلیمات کی علمی تشریح کی گئی، اور اس پر عقلی دلائل، اور رد و قدح یکجا کئے گئے، تو علم کلام نے جنم لیا، قرآن کے قانونی مسائل پر جو بحثیں کی گئیں، انھوں نے علم فقہ کا جامہ پہن لیا، قرآن پاک کے لفظوں سے کسی مسئلہ کے سمجھنے کے جو اصول بنائے گئے، ان کا نام اصول فقہ ہوگیا، رسول کی تشریحات پر روایتوں اور سندوں کی حیثیت سے جو گفتگو شروع ہوئی، وہ اصول حدیث کا ماخذ قرار پائی، اور ان کے راویوں کی تاریخی اور اخلاقی گفت و شنید نے اسماء الرجال کا دفتر تیار کر دیا، قرآن پاک کے لفظوں کے صحیح مخرج، طرز ادا، وقف و سکون نے تجوید و قرأت کا فن پیدا کیا، ان لفظوں کی صحیح

لہجوں کے جاننے پہچاننے اور ان کے صحیح اعرابوں کو معلوم کرنے سے صرف و نحو وجود میں آئی، قرآن کے لفظوں لغتوں اور محاوروں کی دریافت کیلئے علم ادب اور علم لغت کی ترتیب ہوئی، غرض اسلامی علوم و فنون کا ہر خط دراصل اسی نقطہ سے شروع ہوا، اور کبھی کبھی آگے بڑھکر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے مرکز سے دور نکل گیا، یا مرکز سے ہٹ گیا ہے،

دخیل علوم، یعنی علم و فن کا وہ سرمایہ جو دوسری قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کو سپرد ہوا، اگلے مسلمانوں نے ان کو بھی اپنے اسی مرکز سے ملا کر دنیا کو دکھایا، مسلمانوں میں دخیل علوم میں سے سب سے پہلے طب کا فن آیا، طب سے کیمیا کی طرف توجہ ہوئی، چنانچہ عقلی علوم میں سے بنی امیہ کے دور میں یہی دو فن مسلمانوں میں داخل ہوئے، امیر معاویہ کے زمانہ میں ابن اثال نے یونانی سے طب کی بعض کتابوں کے ترجمے کئے، مروان کے زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے سریانی سے ایک طبی سفینہ (کناش) کا ترجمہ عربی میں کیا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسکو اپنے زمانہ میں شائع کیا، اور خالد بن ولید بن معاویہ نے کیمیا اور طب کو عربی میں فروغ دیا، اور ہشام کے کاتب ابو جبلہ سالم نے ارسطو کی کتابوں کو عربی قالب میں ڈھالا،

عباسیوں کے زمانہ میں سب سے پہلے ایرانیوں کے اثر سے نجوم کے فن نے منصور عباسی کے دربار میں جگہ پائی، نجوم نے ریاضیات اور فلکیات کی طرف رُخ پھیرا، اور مامون کے عہد میں جہمیہ کی تحریک نے فلسفہ کی داغ بیل ڈالی، اور سلطنت کے دور دراز حصوں میں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطع مسافت کے خیال نے اسی زمانے میں مختصر اور اچھے راستوں کی دریافت کا شوق پیدا کیا، جس نے بعد کو جغرافیہ کا ہیولیٰ اختیار کر لیا، غرض اسلام میں عقلی علوم و فنون نے اسی طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اشاعت پائی، اور تیسری صدی کے وسط سے مسلمانوں میں ان فنون کے اہل کمال پیدا ہونے لگے، عام اندازہ یہ ہے، کہ مسلمانوں میں اہل تحقیق تیسری صدی ہجری سے لیکر ساتویں صدی تک گذرے ہیں، یعنی اسوقت تک رہے، جبتک چنگیزیوں کی سفاکی نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دی، اور ایران و خراسان و عراق میں اہل علم کے قتل عام کا بازار نہ گرم ہوا،

محقق طوسی المتوفی ۶۷۲ھ اور علامہ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ موسم بہار کا دور اختتام ہیں، اس کے بعد شاذ ونادر ہی اہل تحقیق پیدا ہوئے، اور اگر ہوئے تو وہ نوادر اور مستثنیات کے حکم میں ہیں، اور اس کے بعد سے جو دور شروع ہوا، وہ اہل تقلید کا ہے، یعنی ان لوگوں کا جن کا کام اگلوں کی تحقیقات کی نقل اور تکرار ہے، اور ان میں سے جو لوگ ممتاز ہوئے، انھوں نے اگلوں کی تصانیف کی شرحیں کیں، یا حاشیے اور تعلیقات لکھے یا ان کی اچھی اچھی کتابوں کی تلخیص اور اختصار کیا،

میں ایک مثال دیدوں، شیخ عبد القادر جرجانی المتوفی ۴۷۱ھ نے معانی وبیان میں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ دو کتابیں لکھیں، جو حقیقت میں اس فن کے مباحث کا جوہر اور مغز ہیں، اور جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ سے لیکر ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ تک اس فن کے جو مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کو محیط ہے، امام رازی المتوفی ۶۰۶ھ نے الایجاز فی دلائل الاعجاز میں شیخ کی دونوں کتابوں کو جن میں حد درجہ تفصیل و تطویل تھی، نچوڑ لیا، سکاکی المتوفی ۶۲۶ھ نے مفتاح العلوم کی تیسری قسم میں اس کا خلاصہ کر کے شامل کر لیا، خطیب قزوینی المتوفی ۷۳۹ھ نے تلخیص المفتاح میں مفتاح کا خلاصہ کر لیا، سعد الدین تفتازانی المتوفی ۷۹۳ھ نے اس کی مطول اور مختصر دو شرحیں لکھیں، اور معانی وبیان کو منطق کے قریب کر دیا، اور عصام الدین اسفرائینی المتوفی ۹۴۱ھ نے اطول کے نام سے معانی وبیان کو بالکل منطق یعنی ذوقی چیز کو عقلی بنانے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد ان پر حواشی لکھے جانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت سے لیکر آجتک ہمارے ہاں کے عربی درسیات میں مختصر المعانی، مطول اور اطول کے سوا معانی اور بیان کے فن میں قدما کی ہر چیز آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، اور اسوقت تک سامنے نہیں آئی جبتک مفتی عبدہ مرحوم کی کوشش سے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ مصر میں نہ چھپیں، اور دار العلوم ندوۃ العلماء نے انکو اپنے نصاب درس میں داخل کر کے انکو ہندوستان کے مدرسوں میں روشناس نہ کیا،

اسی طرح دوسرے فنون کا حال ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کا رواج متاخرین کے دور میں ہوا، لودھیوں کے زمانہ

تک ہندوستان میں اہل ترکستان کے اثر سے صرف فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کا رواج تھا، اور اسی کا نام علم دانائی تھا، جدال ومناظرہ انہی فنون میں ہوتا تھا، انہی کو پڑھکر علماء قاضی اور مفتی اور محتسب کے شاہی عہدے پاتے تھے، دینیات میں تفسیر بیضاوی ومدارک کے کچھ اجزاء اور حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا، سب سے پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی حرمین محترمین سے کتب احادیث کا تحفہ ہندوستان لائے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادہ نے صحاح ستہ کے فیض سے ہندوستان کو معمور کیا، ان کتابوں کا شاہ عبد العزیز کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ مولینا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی زبانی مولوی حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) اپنی طالب علمی کے زمانہ (۱۳۱۲ھ) کا یہ قصہ سناتے ہیں کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر رازی کا ایک نسخہ صرف شاہی کتب خانہ میں تھا، شاہ صاحب کو جب ضرورت ہوتی تھی، تو بڑے اہتمام سے اسکو شاہی کتب خانے سے منگواتے تھے، بخاری شریف کا یہ حال تھا کہ درس کے پورے حلقہ میں ایک یا دو نسخے ہوتے تھے، ان کے اجزاء توڑ توڑ کر طالب علموں میں تقسیم ہوتے تھے، اور ہر ایک سبق الگ الگ جزو سے باری باری سے ہوتا تھا،

ہندوستان کے پورے دور میں عربی کا ایک بھی کامل شاعر یا ادیب جو عربوں کے نسج وطرز پر شعر یا نثر لکھتا ہو، پیدا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ نثر میں مقامات حریری جیسی بے مزہ کتاب اور نظم میں دیوان متنبی جیسے عجمیانہ شاعری کا دیوان عربی طالب علموں کے سامنے رہتا تھا، اس پورے دور میں قاضی عبد المقتدر دہلوی المتوفی ۷۹۱ھ نظم میں، اور شاہ ولی اللہ دہلوی نثر میں ایسے ہوئے ہیں، جن کے نام دوسرے اسلامی ملکوں کے ارباب فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ بے تکلف لئے جا سکتے ہیں

حماسہ ابو تمام جو عربی شاعری کا صحیفہ ہے، ہندوستان میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری المتوفی ۱۳۰۴ھ سے پہلے نامعلوم تھا، ان کے زمانے سے یہ کتاب درس میں داخل ہوئی، اور مدرسوں میں عام ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ مولینا فیض الحسن صاحب اور ان کے شاگردوں میں مولینا شبلی اور مولینا حمید الدین فراہی وغیرہ نے

عرب کے ذوق کو ہندوستان میں زندہ کیا، فلسفہ و منطق کا آغاز گو ہندوستان میں پہلے سے تھا، لیکن سکندر لودی کے عہد میں شیخ عبد اللہ تلنبی، اور مولینا عزیز اللہ سنبھلی کے دم سے ان کا رواج ہوا، یہ دونوں بزرگ ملتان سے ادھر آئے تھے، ان سے پہلے منطق میں شرح شمسیہ اور علم کلام میں شرح صحائف کے سوا کچھ اور نہ پڑھایا جاتا تھا، اس کے بعد اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا، شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، اور میر زاہد ہروی نے منطق و فلسفہ کا درس عام کیا، اور انہی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ، فرنگی محل اور خیرآباد کی درسگاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح وحواشی کی بہار آئی، حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد ملا عبد السلام لاہوری، اور ان کے شاگرد ملا عبد السلام اودھی، ان سے ملا قطب الدین سہالوی، اور ملا قطب الدین سہالوی سے ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا امان اللہ بنارسی، اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، مگر ملا نظام الدین کے وارث ملا بحر العلوم ہوئے، بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا، میر زاہد کا فیض شاہ عبد الرحیم صاحب دہلوی کو، اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو، ان سے شاہ عبد العزیز صاحب کو پہنچا، اور ان سے ملک میں عام ہوا،

متاخرین کے ان شروح وحواشی نے اصل فن کا خون کر دیا، چنانچہ اس عہد کی دماغی پیداوار زیادہ تر لفظی مباحث، اعتراضات، شکوک اور ردّ و بدل ہیں، اس دور میں اسلامی علوم وفنون میں سوائے نقل و تقلید اور بحث و مناظرہ کے ایک ذرّہ اضافہ نہیں ہوا، اس دور کے مستثنیات میں حافظ ابن حجر عسقلانی، امیر اسمٰعیل یمانی، صالح بن مہدی مقبلی یمانی، ابن خلدون مغربی، مقریزی مصری، شاہ ولی اللہ دہلوی، اور بحر العلوم فرنگی محلی ہیں، کچھ اور بھی نام ہوں گے، مقصود استقصا نہیں،

اسلامی علوم وفنون کا اصلی سرمایہ وہی ہے، جو قدما نے ہمارے لئے ترکہ چھوڑا، اور جسکو ہمارے بزرگوں نے سینوں سے لگا کر رکھا، اس کارنامے کو فخراً بیان کیا جا سکتا ہے، کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کی

جتنا تحریری سرمایہ دنیا کو دیا، اور جس طرح کتبخانوں میں ان کو محفوظ رکھا، اس میں کوئی دوسری قوم انکی برابری نہیں کر سکتی، جس کثرت سے اسلامی ملکوں میں کتابیں لکھی گئیں، اور کتب خانے قائم ہوئے، وہ اس خزان کے دور میں بھی بہار کے موسم کا پتہ دیتے ہیں، مسلمانوں کے زمانہ میں نہ تو چھاپے خانے تھے، اور نہ ریل اور ڈاک کی آسانیاں تھیں، پھر بھی اہلِ شوق کی کوششوں سے "وراقین" و وراقہ کے ذریعہ سے ہر کتاب کے اس کثرت سے نسخے فراہم ہوتے تھے، کہ آج بھی اس پر حیرت ہوتی ہے، کتاب مشرق کے ایک گوشہ میں لکھی جاتی تھی، اور چند روز میں مغرب کے دوسرے گوشہ میں پہنچ جاتی تھی، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے، کہ ابو الفرج اصفہانی المتوفی سنہ ۳۵۳ھ کی کتاب الاغانی لکھی تو مشرق میں گئی، اور سیف الدولہ ہمدانی کو ہدیہ دی گئی، مگر اس کا سب سے پہلا نسخہ اسپین کے خلیفہ حکم المتوفی سنہ ۳۳۶ھ کی خدمت میں پیش ہوا، اور خلیفہ اس اولیت پر فخر کرتا تھا،

ہندوستان کا یہ کارنامہ فخر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ شاہجہانی عصر کے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی نے علم کلام اور معقولات پر جو شرح وحواشی لکھے، وہ لکھے تو ہندوستان میں مگر ان کی نقلیں عثمانی سلاطین کے پاس تحفۂ شاہی کے طور پر قسطنطنیہ جاتی تھیں، یہی سبب ہے کہ اون کی تصانیف قسطنطنیہ سے شائع ہوئیں،

اسلامی علوم وفنون کی کتابوں پر تین سب سے بڑے سخت وقت گذرے ہیں، جن میں بزرگوں کا بڑا اندوختہ تلف ہو گیا، یا اخلاف کے ہاتھوں سے نکل گیا، سب سے پہلا وقت تو وہ ہے، جب ساتویں صدی میں چنگیز خان اور ہلاکو کے ہاتھوں سے خراسان اور بغداد کے کتب خانے تباہ ہوئے، دوسرا وقت وہ تھا جب نویں صدی میں اسپین میں اسلامی حکومتوں کا خاتمہ ہوا، اور تیسرا وقت وہ ہے، جب موجودہ یورپ کی تعدی نے اسلامی علوم وفنون کے ذخیروں پر پہلے فوجی قبضہ کر کے پھر خرید خرید کر یورپ کے کتبخانوں میں منتقل کر دیا، جو کچھ اسوقت ہمارے پاس ہے، وہ یا مصر کے سرکاری کتب خانے میں یا دمشق یا حلب کے بعض کتب خانوں میں یا قسطنطنیہ کے موقوفہ کتبخانوں میں ہے،

حرمین میں جو کتابیں تھیں، وہ گذشتہ فتنہ میں تباہ ہوئیں، مدینہ منورہ میں گو کئی کتب خانے ہیں، مگر متولیوں کی غفلت سے تباہ و برباد ہیں، صرف دو کتبخانے ذکر کے قابل رہ گئے ہیں، ایک شیخ الاسلام کا کتبخانہ جس کی نادر کتابیں ترکوں نے مدینہ چھوڑتے وقت شام میں منتقل کر دیں، اور شام کے تخلیہ کے وقت صندوقوں میں بھری ہوئی تلف ہو رہی تھیں، کہ کتب خانہ کے ترک متولیوں اور امیر فیصل کی کوششوں سے جو بچیں، وہ واپس آسکیں، دوسرا وہاں کا کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کا کتب خانہ ہے، جو سلطان محمود عثمانی کی یادگار ہے، اس کے کتب خانہ کو ۱۹۲۶ء میں جب میں نے دیکھا، تو یہ حال تھا، کہ بڑی مشکل سے متولیوں نے اس کے بند دروازوں کے قفل کھولے، لیکن فہرست میں دیکھ کر جس نادر کتاب کو مانگا، معلوم ہوا، کہ ترک اسکو اپنے ساتھ لیگئے،

ابھی اس بڑی جنگ کے بعد جب عراق انگریزوں کے ہاتھ آیا تو دجلہ و فرات کی روانی انگلش چینل کی موجوں میں مل گئی، اور کتابیں یورپ کے کتب فروشوں کی دوکانوں میں بہ بہ کر آنے لگیں، کہتے ہیں، کہ اسپین کا بچا کھچا سرمایہ اسکوریال لائبریری میں ہے، اور ایشیاے وسطی کا ذخیرہ روس کے کتب خانوں میں منتقل ہوگیا ہے،

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں لکھنؤ اور دلی کے شاہی کتب خانوں پر جو آفتیں آئیں، وہ مورخوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں، اور شاید ہمیشہ کے لئے رہیں، کچھ حصہ تو انگلستان کو منتقل ہوگیا، کچھ فوجی افسروں اور سپاہیوں میں بٹ گیا، پھر انھوں نے قدردانی سے انگلستان کے قومی کتب خانوں کے سپرد کر دیا یا نج کے طور پر بیچ ڈالا اور کتابیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں، اور اب بھی اس قسم کے مال غنیمت کا پتہ یورپ کے کتب خانوں میں ملتا ہے،

جرمن ڈاکٹر اسپرنگر نے جو اس زمانہ میں بعض سرکاری عربی مدرسوں کے انچارج تھے، اور جنھوں نے اودھ کے شاہی کتبخانوں کی فہرست تیار کی تھی، اس قسم کے سرمایہ کو بڑی حفاظت سے اپنے ملک میں پہنچا دیا، اودھ کے سرکاری کتب خانہ کی کتابیں آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں،

اودھ کے شاہی کتب خانوں کی پُردرد کہانی مولینا شبلی مرحوم نے ایک چشم دید گواہ مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین لکھنوی کی زبانی مجھ سے بیان فرمائی تھی، خواجہ صاحب کہتے تھے، کہ فرنگی محل کے پل سے لیکر تحسین گنج تک کتابوں کا اتنا ڈھیر بکھرا ہوا تھا، کہ آنے جانے والے کتابوں کو روندکر آتے جاتے تھے، اور سنا ہے کہ گورنمنٹ نے ان کو نیلام کردیا، اور کتابیں ردی کے بھاؤ بکیں، بہرحال اتنا شکر ہے کہ بریلی سے حافظ الملک رحمت خاں اور لکھنؤ سے شاہان اودھ کی کچھ کتابیں رامپور چلی گئیں، جو آجتک وہاں سرمایۂ افتخار ہیں، لکھنؤ میں مولوی ناصر حسین صاحب کے خاندانی کتب خانے کی بنیاد بھی لکھنؤ کے شاہی کتب خانوں کی غارت شدہ کتابوں سے پڑی، اس زمانہ میں خان بہادر مولوی مفتی محمد قلی خاں موسوی نیشاپوری کنتوری المتوفی سنہ ۱۲۶۰ھ صدر الصدور تھے، انھوں نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی نیلام کی ہوئی کتابیں خرید لیں، ٹونک کا سرمایہ بھی غنیمت ہے، جو وہاں کے ایک عالم رئیس کی محنت کا نتیجہ ہے،

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس نے اس افراتفری کے زمانہ کے بعد کتابوں کو خریدنا شروع کر دیا، اور اس طرح اچھا خاصہ ذخیرہ ہندوستان کے اندر رہ گیا تاہم اس کے ایجنٹ مولویوں کو یہ واقعہ ہے کہ نادر کتابوں کو کوڑیوں کے مول خریدنے اور یورپ اور امریکہ کے شائقوں کے ہاتھوں بیچنے کا چسکا پڑا، اور یہ کاروبار ابتک جاری ہے،

نواب عماد الملک مرحوم کا یہ کارنامہ بھلانے کے لائق نہیں کہ انھوں نے سرکار آصفیہ کو ان پراگندہ موتیوں کو اپنے خزانۂ عامرہ میں بحفاظت جمع کرنے کی توجہ دلائی، اور کتب خانۂ آصفیہ کا وجود ہوا جس کی بدولت دکن کا بڑا سرمایہ محفوظ رہا، دوسری طرف پٹنہ کے مولوی خدا بخش خاں مرحوم نے اپنی ساری کمائی کو انہی جواہرات کے خریدنے اور جمع کرنے میں خرچ کر ڈالا اور آج پٹنہ کا مشرقی کتبخانہ ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی یادگاروں کا نادر مرقع ہے، علیگڈھ بھی ایک ایسے ہی شائق رئیس بن رئیس کا مسکن ہے جنکے حبیب گنج میں لکھنؤ، لاہور، دلی اور دکن کے انمول موتی ہیں،

کتابیں کہاں سے کہاں اور کیونکر پہونچیں ان کی دو دلچسپ کہانیاں آپ کو سناتا ہوں،

دار المصنفین کے کتب خانہ میں شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہے، اسکے پہلے صفحہ پر جو اس کی سرگذشت مختلف مالکوں کے قلم سے ثبت ہے، وہ یہ ہے، کہ یہ نسخہ کوئی ایرانی فاضل میر صفی الدین سنہ ۱۰۲۰ھ میں کسی بادشاہ کے لئے ہدیہ لائے، پھر سنہ ۱۰۲۱ھ میں محمد قلی قطب شاہ والی دکن کے کتب خانہ کی ملکیت ہوا، پھر کوئی امیر الدولہ عماد الملک اس کے مالک بنے، اس کے بعد سنہ ۱۱۹۴ھ میں کسی طرح شمس الدولہ منیر الملک مسٹر ہنری ونسٹرٹ بہادر تہور جنگ کے قبضہ میں آیا، اس سے یکم مئی سنہ ۱۷۸۰ء کو وہ کسی انگریز بودم کے قبضہ میں کلکتہ آیا، وہاں سے محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے علم دوست رئیس ڈپٹی مولوی عبد الغفور صاحب مرحوم کی ملکیت بنا، اور اب وہاں سے وقف ہو کر دار المصنفین کے کتب خانہ میں آیا ہے،

زیب النساء بنت عالمگیر کے دربار کے عالم معین بن ولی قزوینی جنھوں نے شہزادی کے حکم سے امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ فارسی میں زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا ۱۰۸۶ھ میں شہزادی کی اجازت سے حج و زیارت کو حرمین گئے تھے، اس مقدس سفر کی یادگار میں انیس الحجاج نام ایک مختصر کتاب لکھی تھی، جس میں بڑا حصہ سفر کے حالات کا اور کچھ مناسک حج کا ہے، اس میں بندر سورت، مخا، جدہ، اور امیر مکہ شریف برکات، اور ترکی والی، اور محمل وغیرہ کے جلوسوں کی قلمی تصویریں ہیں، اس کا ایک ناقص حصہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے، اسپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں اس کے ایک ایسے نسخہ کا ذکر کیا ہے جو کسی دوسری کتاب کے ساتھ ایک جلد میں شامل تھا، اور اس کے اوراق کچھ غیر مرتب تھے، اور جس میں تصویریں تھیں، ابھی حال میں ۱۵؍ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ کو اس کا ایک نسخہ مونگیر کے ایک دیہات سے دار المصنفین کے کتب خانے میں خرید اگیا، جس پر گو مہر نہیں، تاہم اسپرنگر کے بیان کا حرف حرف صادق آتا ہے، اور تعجب ہے کہ کہاں اودھ کا شاہی کتب خانہ اور کہاں مونگیر کا ایک دیہات، شاہی کتب خانوں کی اکثر کتابوں کی یہ انقلابی تاریخ ہر بڑے کتب خانے کے نسخوں کی لوح پر ثبت نظر آتی ہے،

بہر حال ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے، ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در و باشد، (باقی)

عالمگیر کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

(۲)

پھر بھی عالمگیر کا دربار شعراء سے خالی نہ تھا، وہ ان کے اشعار سنتا، اور موقع بموقع اپنے جود و سخا سے فیضیاب کرتا تھا، اور ان کی استعداد و لیاقت کے مطابق عہدے دیتا تھا، وہ مفت خوری کا قائل نہ تھا اور نفس شاعری کو ذریعۂ معاش ٹھہرانا پسند نہ کرتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس نے اپنے دربار کے شعراء کو بھی ملکی منصب دیکر روزی کمانے کا ذریعہ عطا کیا، نفس شاعری کا منصب اس نے جاری نہیں کیا،

اس عہد کے قابلِ ذکر شعراء کے حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں،

۱۔ موسوی خان میرزا معز الدین محمد فطرت،

میر محمد زمان مشہدی کا نواسہ تھا، عین شباب کے زمانہ میں اپنے باپ مرزا فخر سے خفا ہو کر اصفہان چلا آیا، جہاں آقا حسین خوانساری سے علوم و فنون کا استفادہ کیا، بہت ہی ذہین و فہیم تھا، اسلئے علوم عقلیہ میں یکتائے روزگار ہوا، سنہ ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آیا، تو اورنگ زیب نے اس میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھکر اپنے لطف و کرم سے مالا مال کیا، شاہ نواز خاں کی لڑکی یعنی شاہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے اسکی شادی انجام پائی اور وہ عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا، لیکن وہاں کے ناظم سے اس کا اتفاق نہ رہا، اسلئے واپس بلا لیا گیا، سنہ ۱۰۹۹ھ میں موسوی خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور دیوان تن مقرر ہوا، ایک سال بعد تمام دکن کا دیوان ہوا،

سنہ ۱۱۰۱ھ میں فوت ہوا[1]

میرزا معزالدین بہت ہی خوددار اور نازک مزاج تھا، ایک موقع پر عالمگیر کو اس سے رنجش پیدا ہوگئی، تو وہ تھوڑے دنوں تک شاہی التفات سے محروم رہا، مگر وہ بھی اپنی خودداری کے باعث بے نیاز رہا جب لوگوں نے سمجھایا کہ بادشاہ سے اپنی تقصیر کی معافی مانگو، تو اس نے ایک معروضہ لکھا جس میں یہ شعر تھے،

در طلب ما بے زبانان امت پروانہ ایم — سوختن از عرضِ مطلب پیش من آسان تر است

شد از غرورِ غلامی زبانِ عرض خموش — مرا براہِ خطا، ایں صوابہا انداخت،

از موجِ فیض بحر کرم را قرار نیست — اہلِ سوال بیہودہ ابرام می کنند،

عالمگیر نے اس درخواست کو پڑھا تو یہ لکھا،

بے زبانی می کشاید بندہا سخت را — در قفس طوطی ز منقار سخنگوے خود است

لیکن بہ

ہیچ مردے در پئے اصلاحِ خوے خویش نیست — ہر کرا دیدم در آرایشِ خوے خود است

"بموجب حدیث السّلطان ظلّ اللہ ہرگاہ سلطان عصر با نوکران خود التجا مطلب او کند او جواب باین خوبی می دہد، از اخلاق بعید است کہ التفات بحالِ او نشود"[2]

موسوی خاں شعر گوئی میں یکتائے زمانہ تھا، مآثر الامراء[3] میں اس کا ذکر اس طرح ہے،

"بہشیاری طبع رسا و ذہن عالی در علوم عقلیہ یگانۂ روزگار گردید..... چو طالعش مانند استعداد بلند بود مشمول عواطف عالمگیری گردیدہ مناصب سرعزت برافراخت...... در خوش خیالی و نازک معانی بے انباز و بہ انشا پردازی و دخت آفرینی ممتاز بود، در اول مشق شعر فطرت تخلص میکرد"

[1] مآثر الامراء جلد ۳ صفحہ ۶۳۳، نیز مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۶ [2] رقائع عالمگیر صفحہ ۳۰، [3] مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۱۰۱ھ۔

آخر موسوی دل نشین او افتاد"[1]

شیخ ناصر علی سرہندی، صاحب مآثر الکرام اس شاعر شیریں مقال کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں

"شیر نیستانِ سخنوری است و مرد میدانِ معنی گستری، ذوالفقارِ کلکش بہ تسخیر قلمرو بیان پرداختہ، و تصرف طبعش آفتاب سخن را از افق عربی راجع ساختہ سرخوش گوید،

در ملک سخن بود جہانگیر علی — در مشرب دل ولی علی، پیر علی،

با شعر علی نمی رسد شعر کسے — زانساں کہ خطِ کس بخطِ میر علی،

عالمگیر نے ناصر علی کو سنہ ۱۰۹۵ھ میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد بعض اسباب کی بنا پر وہ گوشہ نشین ہو گیا، سنہ ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر نے اسکو اپنے عنایات و اکرام سے پھر مالا مال کیا، منصب خطاب، خلعت خاصہ اور شمشیر عطا کر کے الہ آباد کا ناظم مقرر کیا،[2]

نعمت خان عالی، عالی تخلص تھا، اور میرزا محمد علی نام حکیم فتح الدین شیرازی کا لڑکا تھا، میرزا محمد ہندوستان ہی میں پیدا ہوا لیکن صغر سنی میں باپ کیساتھ شیراز چلا گیا، اور وہیں کسب کمال علم کیا، ہندوستان آیا تو ملا شفیعائی یزدی کے سامنے بھی زانوے تلمیذ تہ کیا، یہاں اکر طب کا آبائی پیشہ اختیار کیا، پھر اورنگ زیب نے اپنے ملازمانِ خاص میں داخل کر لیا، اورنگ زیب نے جب حیدرآباد فتح کیا، تو اس نے یہ تاریخ کہی،

از نصرت پادشاہ غازی، — گردید دل جہانیان شاد،

آمد بقلم حساب تاریخ، — شد فتح بجنگ حیدرآباد،

اورنگ زیب نے خوش ہو کر اسکو خلعت و انعام عطا کیا،[3]

[1] مآثر الامراء جلد ۳ صفحہ ۶۳۳، کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۶ پر ملاحظہ ہوں، [2] دفتر ثانی صفحہ ۱۳۲ پر کلام کے نمونے دئے ہوے ہیں، [3] مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۰۹۶ھ،

سنہ ۱۱۰۲ھ میں اسکو نعمت خاں کا خطاب ملا، اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، آخر عہد میں اورنگزیب نے اسے مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، اور "جواہر خانہ نگین دولت" کا داروغہ بنایا، شاہ عالم کے زمانہ میں دانشمند خاں ہوا، اور شاہنامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیر آباد کہا، وقائع نعمت خاں عالی، مثنوی عشق، خوان نعمت، سخن عالی اسکی منظوم تصنیفات ہیں، وقائع نعمت خاں میں عالمگیر کی ہجو ملیح لکھی ہے، احمد علی سندیلوی اپنے مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں،

"نہایت شوخ و بے باک و حاضر جواب و لطیفہ گوے بود و بملازمت محی الدین اورنگزیب عالمگیر بادشاہ سرفرازی داشت چوں آں بادشاہ نیز قابل دوست و جوہر شناس بود آنرا بمنصب بکاولی امتیاز بخشیدہ نعمت خاں کرد، او در حق نمک ولی نعمت خود نگاہ نداشتہ ہجو ملیح کرد[1]"

اورنگزیب نعمت خاں عالی کی دریدہ دہنی سے واقف تھا، لیکن اس سے وہ قصداً اغماض کرتا تھا، ایک بار کامگار خاں نامی ایک امیر کی شادی کے موقع پر نعمت خاں عالی نے ایک ہجو لکھی تو اول الذکر نے اورنگزیب سے اسکو سزا دینے کی درخواست کی، لیکن اورنگزیب نے لکھا،

"خانہ زاد سادہ لوح (کامگار خاں) می خواہد کہ مارا ہم دریں رسوائی شریک سازد کہ او ہر چہ خواہد در باب ما گوید، و نویسد، و شہرۂ عالم سازد، و بیشتر ہم در باب ما مقصر نبود[2] تلافی باغماض

---

[1] مخزن الغرائب قلمی نسخہ موکہ دار المصنفین اعظم گڈھ، [2] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب کہ فتح دکن کے موقع پر تاخیر ہوئی تو بعض امرا نے اورنگ زیب سے واپس جانے کی درخواست کی، اورنگزیب واپس جانے کے خلاف تھا، اس موقع پر نعمت خاں عالی نے چڑھ کر کہا،

بنشستہ چناں قوی کہ بر داشتنش — کارے دگرے نیست خدا بردارد

عالمگیر ہنس پڑا،

انعام شدہ کہ دیگر از تکاب نکند، باوجود ایں خود کمی نکردہ زبان بریدن و گردن زدن مقدور نیست، باید سوخت، و باید ساخت، رفیق لا یوافقک و لا یفارقک[1]"

میر غلام علی آزاد اس کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ

"حاوی فنون وافر بود و جامع علوم متکاثر، میرزا محمد در نظم و نثر قدرت عالی دارد خصوص در وادی نثر طلسم حیرت می بندد"

مآثر الامرا کا مصنف اسکو ہمیشہ ہاجی کے نام سے یاد کرتا ہے اور لکھتا ہے،

"ہیچ کیے از زبانش نرستہ[2]"

عاقل خان رازی، میر عسکری نام تھا، خواف کا رہنے والا تھا، شاہ جہان کے عہد میں ہندوستان آیا، اور شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں ضلع دار مقرر ہوا، ایام شاہزادگی میں اورنگ زیب کی ایک کنیز (یکے از پرستاران خاص) کا انتقال ہو گیا، جس سے اورنگ زیب روز "تازہ بتازہ و نو بنو" گا نے سنکر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر اورنگ زیب بہت ہی غمگین ہوا، غم غلط کرنے کے لئے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے پوچھا کہ اندوہ و ملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی ہیں، اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا،

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست — در بیابان می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سنکر عرض کیا، کہ

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود — ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

---

[1] وقائع عالمگیر از نبی احمد سندیلوی ص ۶۶، [2] مآثر الامرا، جلد سوم ص ۶۵، اس کے اہاجی کے نمونے مخزن الغرائب میں ملاحظہ ہوں، کلیات نعمت خان عالی کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے، کچھ کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۳۰ پر بھی درج ہیں،

اورنگ زیب نے شعر سُنا تو اس پر رقت طاری ہوگئی، اور اسکو بار بار پڑھتا تھا،[1]

میر عسکری اپنے شعر و شاعری کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور رہا، حضرت برہان الدین رازی کا معتقد تھا، اس لئے رازی تخلص کرتا تھا، جب اورنگ زیب دکن سے دارا سے لڑنے چلا، تو قلعۂ دولت آباد میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑا، میر عسکری اس شہر کا نگہبان ہوا، اورنگ زیب جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسکو عاقل خاں کا خطاب دیا، اور دوآبہ کا فوجدار مقرر کیا، لیکن چند مہینے کے بعد صحت کی خرابی سے خانہ نشین ہوگیا، اس مدت میں اسکو ۵۰۰ روپئے ماہوار ملتے رہے، سنہ ۱۰۷۴ھ میں پھر ملازمت شاہی میں منسلک ہوا، اور داروغۂ حرم خاص مقرر ہوا، جس پر بہت ہی معتمد امیر مامور ہوتا تھا، اس زمانہ میں اورنگزیب کے عنایات و اکرام سے برابر فیضیاب ہوتا رہا، سنہ ۱۰۸۱ھ میں اسکو ایک شاہی خلعت عطا کیا گیا اور ڈاک چوکی کا داروغہ مقرر ہوا، لیکن اس عہدہ سے مستعفی ہوا، سنہ ۱۰۸۶ھ میں اس کا ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہوا، سنہ ۱۰۹۰ھ میں بخشی دوم کے عہدہ پر مامور ہوا، سنہ ۱۰۹۱ھ میں اس کو دہلی کی صوبہ داری سپرد کی گئی، جس عہدۂ جلیلہ پر اپنی وفات تک فائز رہا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے، کہ عاقل خان کی خدمات، دیانت داری، اور اخلاص کیوجہ سے عالمگیر اسکی خودرائی و خود آرائی سے چشم پوشی اور عمدہ و اہم خدمات اسکے حوالے کرتا تھا،[2]

ظفر نامۂ عالمگیری، ایک دیوان، مرقع تصنیف رازی، اور چند مثنویاں، نغمات العشق، ثمرات الحیواۃ، شمع و پروانہ، اور مہر و ماہ، اسکی یادگاریں ہیں، ظفر نامہ عالمگیری میں عالمگیری عہد کے واقعات، جنگ بیجاپور سے میر جملہ کی وفات تک درج ہیں، مرقع تصنیف رازی میں مولانا جلال الدین رومی کی طرز پر ایک مثنوی لکھی، ثمرات الحیواۃ اسکے مرشد، شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے، اس نے اسکو ترتیب دیا، شمع و پروانہ میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ ہے، مہر و ماہ میں ایک ہندوستانی قصہ منظوم ہے، مصنف[3] مآثر عالمگیری کا

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۶۸، [2] اوپر کے تمام واقعات مآثر عالمگیری سے لئے گئے ہیں، [3] ہمیشہ بہار از کشن چند اخلاص بحوالہ فہرست مخطوطات کتب خانہ شاہ اودھ مرتبہ اسپرنگر ص ۹۴ - ۵۴۳،

بیان ہے، کہ مثنوی مولینا روم کے دقائق کو حل کرنے میں وہ اپنے کو یکتا خیال کرتا تھا،[1]

مرآۃ الخیال کا مصنف اسکی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"وصاف رنگینی کلامش را خامہ از قلم نرگس و سیاہی از دوات لالہ باید شنگرف از رنگ گل و مقرر از آواز بلبل شاید از رشک نسخۂ مہر و ماہش ماہ و آفتاب در رو ساختن و از مشاہدۂ رنگینی و نزاکت سخنش گل و بلبل در رنگ باختن دیوانش عالمے است پر از یوسف طلعتان معانی دلنشین و سواد اعظمی از سیہ فامان حروف مشکیں و در رشتہ بازار سطورش متاع در دانہا را انبار و بر تختۂ دوکان صفحاتش گلہائے مضامین رنگین گلزار، گلزار، ہر سطرش زلف معشوقی سراپا ناز و ہر نقطہ اش داغ دل عاشقی خانہ بر انداز"[2]

ملا محمد سعید اشرف مازندرانی، ملا محمد صالح مازندرانی کے لڑکے اور ملا محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے اوائل حکومت میں ہندوستان آئے، ان کی استعداد و قابلیت کو دیکھکر عالمگیر نے ان کو زیب النساء کا اتالیق مقرر کیا، سنہ ۱۰۹۳ھ میں زیب النساء سے اجازت لیکر اصفہان واپس گئے، پھر واپس آئے تو شہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ عظیم آباد میں رہے، شہزادہ انھیں بہت ہی محبوب رکھتا تھا، باوجود کبر سنی کے انھیں اپنے پاس برابر بٹھائے رہتا تھا، آخر عمر میں بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے مگر مونگیر پہنچکر انتقال کر گئے، یہیں ان کی قبر بھی ہے، ان کی نسبت صاحب مآثر الکرام رقمطراز ہیں،

"صاحب جودت بود، و شاعر والا قدرت طبع چالاکش معانی تازہ بہم می رساند، و عجائب گلہا در جیب و دامن سامعہ می افشاند..... دیوان ملا سعید اشرف بمطالعہ در آمد، انواع شعر و قصیدہ و غزل و مثنوی و قطعہ وغیرہا دارد، و ہمہ جا حرف بقدرت می زند،"[3]

روشن ضمیر، ایران کا مشہور شاعر تھا، عالمگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور شاہی

---

[1] مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۱۰۷ ہجری [2] مرآۃ الخیال ص ۳۶۹ [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۱۶،

منصب داروں میں مقرر ہوا[1] خافی خان لکھتا ہے :-

"روشن ضمیر کہ از روشن ضمیران صاحب کمال و مستعدان آن زمانہ گفتہ می شد، و در نظم فارسی و

اشعار ہندی مشق او بجائے رسیدہ بود کہ امیر خسرو ثانیش تواں گفت"[1]

تذکرۂ مراۃ الخیال کا مصنف روشن ضمیر کا ذکر بہت ہی عزت و احترام کیساتھ کرتا ہے،

"آسمان فضل و کمال را بدر منیر عالی قدر بلند مکان میرزا روشن ضمیر از اعاظم مستعدان و اکابر

عالی فطرتان روزگار بودہ، چنانکہ در عربی و فارسی لطائف خسروی بظہور آوردہ، و در علم ہندی

از ثقات آن فن گذرانید، علمائے ہند اکثرے پشت دست و روئے امید در پیشش می نہادند و

در علم لاجل موسیقی بجائے رسید کہ استادان ماہر فنش گردیش مباہات می نمودند، گوینید بچہار دہ ہزار

نواہائے تباین سامعہ نواز اہل صحبت گردیدہ بود، در اکثرے ازاں مقامات تصنیفات عربی

و فارسی ہندی ساخت و با ہزاراں تر زبانی علم بلند آوازگی برافراخت"[2]

اورنگزیب عالمگیر نے جب کلام پاک حفظ کیا، تو اس موقع پر روشن ضمیر نے یہ تاریخ لکھکر گذرانی،

محی الدینی و مصطفے حافظ تو، صاحب سیفی و مرتضی حافظ تو،

تو حامی شرع و حامی تو شارع تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو،

عالمگیر نے خوش ہو کر اسکو انعام میں سات ہزار روپئے عطا کئے[4]،

جب اورنگ زیب شہزادہ شجاع سے لڑ رہا تھا، تو اس نے مندرجۂ ذیل تاریخ لکھ کر

پیش کی،

اے حرز تو سورۂ تبارک بادا، پیوستہ ترا تاج و تبارک بادا،

---

[1] ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین، [2] خافی خان جلد دوم ص ۵۰، [3] تذکرۂ مراۃ الخیال ص ۲۲۸،
[4] مراۃ الخیال ص ۲۲۹،

جستم ز پی شگون فتحت تاریخ دل گفت شود فتح مبارک بادا
۱۰۶۹

اورنگزیب کو یہ تاریخ بہت پسند آئی، اس نے انعام میں پانچ ہزار روپئے مرحمت کئے[1]،

ہندی میں اس کا تخلص پتھی تھا، بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا، لیکن ہندی

کے اشعار کہنے میں اعلیٰ مہارت رکھتا تھا، یار جاتک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ اس

نے فارسی زبان میں کیا[2]،

رفیع خان باذل مشہدی خواجہ شمس الدین حافظ سے نسبی تعلق رکھتا تھا، اس کا خاندان مشہد سے

ہندوستان شاہجہاں کے زمانہ میں آیا، اس کا چچا میرزا محمد طاہر، وزیر خاں عالمگیر کے زمانہ مین برہان پور

اکبر آباد اور مالوہ کا صوبہ دار رہا، رفیع خاں باذل شاہجہان آباد میں پیدا ہوا، جوان ہوا تو دامن دولت عالمگیری

سے وابستہ ہو کر سرکار بانس بریلی کا حاکم مقرر ہوا، مآثر الکرام میں اس کے شعر و شاعری کا بیان اس

طرح لکھا ہوا ہے،

"خیلے قوت بیانے دارد، و بہ اقتضائے تخلص خود فراوان جواہر زواہر بذل وا ثیار می نماید، حملۂ

حیدری و قریب نود ہزار بیت مشہور عالم است"[3]

التفات خاں نقد صفاہانی طاہر نام میرزا محمد طاہر تھا، اصفہان کا رہنے والا تھا، عالمگیر

کے عہد میں ہندوستان آیا، مخلص خاں کے ذریعہ سے شاہی ملازمت اور منصب حاصل کیا، اور التفات خاں

کے خطاب سے سرفراز ہوا، بیڑ کا جو مضافات اورنگ آباد میں واقع ہے، فوجدار مقرر ہوا، صاحب مآثر

الکرام لکھتے ہیں،

"ذکی الطبع بود و نثر مستعدانہ می نوشت، و بمثابۂ قدرت داشت کہ سہ کاتب در حضور او

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۵۰، [2] مقالات شبلی ادبی جلد دوم ص ۴۵ نیز ید بیضا از غلام علی آزاد بلگرامی، روشن ضمیر کے
مفصل حالات تذکرہ مراۃ الخیال ص ۲۲۰-۲۲۸ پر ملاحظہ ہوں [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۴۲،

بالسباب کتابت می نشستند، ہر سہ را عبارت خود می فرمود، و فقرۂ لاحق برائے ہر کدام بے
تامل می گفت و ربط کلام از دست نمی داد، و با وصف آن خود ہم دراں حالت مشغول کتابت
می بود؛[1]

فضلاء، فتاوی عالمگیری کی جامعیت و معنویت اس بات کا ثبوت ہے، کہ عالمگیر کا عہد با کمال علماء و فضلاء کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، مگر افسوس ہے کہ ان علماء کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملے، جن علماء و فضلاء کے حالات دستیاب ہو سکے، ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

ملا جیون؛ شیخ احمد نام تھا، امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اصول فقہ میں عالمانہ نظر رکھتے تھے، نور الانوار اصول میں اور تفسیر احمدی قرآن پاک کی احکامی آیتوں کی تفسیر میں ہے، عالمگیر کے استاد تھے، اور وہ ان کے ساتھ بہت ہی تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتا تھا، تذکرۂ علمائے ہند میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"وقت حافظہ بحاسے داشت کہ قصیدہ بشنیدن یکبار با دلی گرفت، و عبارت کتب درسیہ بلا معاینۂ کتاب زبانی می خواند، اولاً قرآن مجید حفظ کردہ کتب درسیہ از علمائے عصر خود تحصیل نمودہ، فاتحہ فراغ بخدمت ملا لطف اللہ ساکن کوڑہ جہان آباد خواند، پس ازان بحضور محی الدین اورنگ زیب بادشاہ باریاب شدہ، بادشاہ موصوف بتعظیم و توقیر تمام پیش آمدہ بحلقۂ تلامذہ در آمد، و تا زندگی پا از جادہ ادبش بیرون نہ نہاد، ہمچنین اولاد بادشاہ موصوف مراعی آدابش بودند، ملا ممدوح الذکر عمر عزیزش را با فادہ درس و تصنیف صرف نمودہ،[2]

سنہ ۱۱۳۰ھ میں انتقال ہوا،

قاضی محب اللہ بہاری، موضع کرا، علاقہ بہار شریف (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، اور قطبیہ ملک

۱؎ مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۴۵، ۲؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۵،

سے تھے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور دوسرے علمائے روزگار سے تعلیم پا کر دکن گئے جہاں عالمگیر نے شاہی ملازمت میں منسلک کر لیا، لکھنؤ اور حیدر آباد میں قاضی رہے، پھر عالمگیر نے اپنے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کی تعلیم کے لئے مامور کیا، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا، اور فاضل خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، سنہ ۱۱۱۹ھ میں انتقال ہوا، اور محلہ چاند پورہ بہار شریف میں مدفون ہوئے،

منطق میں سلم العلوم و افادات اصول فقہ میں مسلم الثبوت، جزء لا یتجزی کے بیان میں الجوہر الفرد اور رسالہ مغالطۂ عامۃ الورود، ان کی تصانیف ہیں، ان کی استعداد و قابلیت مصنف تذکرہ علمائے ہند کے صرف ایک جملہ سے ظاہر ہوگی،

"بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم"[1]

مولوی عبد اللہ سیالکوٹی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے تھے، علاوہ علم و فضل کے صاحب عرفان بھی تھے، اور اپنے اخلاق و افعال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے، عالمگیر کو ان سے ملنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا، سنہ ۱۰۶۰ھ میں حسن ابدال سے پیام شوق ملاقات لکھ بھیجا، دونوں کی ملاقات لاہور میں ہوئی، عالمگیر ملکر بہت ہی محظوظ ہوا، رخصت کرتے وقت خلعت خاص، دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی عطا کیا،[2]
ملا عبد اللہ اور ان کے شاگردوں کو عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کے فارسی ترجمہ کے لئے حکم بھی دیا،[3]

ملا محمد عوض وجیہ، شاہی لشکر کے محتسب اور احکام شرع کے سخت پابند تھے، مصنف مآثر عالمگیری کا خیال ہے کہ ان کا ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا، خدمت احتساب سے علحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی، ان کے فضل و کمال کا ہر صاحب علم کو اعتراف تھا،[4]

بختاور خان، عالمگیر کا بہت ہی محبوب ملازم تھا، داروغہ خواصان تھا، لیکن فن انشاء و تاریخ دانی

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۵، ۲؎ مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۰۸۶ھ، ۳؎ مراۃ العالم، الیٹ جلد ۷ ص ۱۶۰، ۴؎ مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۱۰۰ھ

میں بہت اچھی مہارت رکھتا تھا، مرآۃ العالم اسکی بہت ہی مشہور تصنیف ہے، لیکن اسکے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی متعدد تصنیفات و تالیفات تھیں، مثلاً چہار آئینہ جس میں جنگ علی نقی، اور اورنگزیب کی فتح و کامرانی کے احوال لکھے ہیں، سنائی کے حدیقہ کی تلخیص فرید الدین عطار کی منطق الطیر اور مولینا رومی کی مثنوی کا انتخاب بھی کیا تھا، پھر روضۃ الاحباب اور تاریخ الفی کا ایک مختصر ملخص بھی لکھا تھا، سواد اعظم کے عنوان سے ایک مجموعۂ نظم بھی تیار کیا، ایک بیاض کلام نظم و نثر اساتذہ سے ترتیب دی جس کا نام دلکشا، اور تاریخی نام مجموعہ شعرہائے رنگیں رکھا، ریاضۃ الاولیاء میں اولیاء کے احوال لکھے، آئینہ بخت[1] اسکی ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں بابر کے وقت سے شاہجہان کے عہد تک مختصر حالات اور عالمگیر کی دہ سالہ حکومت کے واقعات با تفصیل درج ہیں[2]،

اپنے علمی ذوق کی بنا پر علماء و شعراء کو بے حد عزیز رکھتا تھا، اور اہل کمال و ہنر کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا، شعراء نے اس کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اس کا جب انتقال ہوا تو اورنگ زیب کو بے حد افسوس ہوا، اس کا جنازہ عدالت گاہ میں منگوا کر خود نماز پڑھائی، اور کچھ دور جنازہ کے ساتھ پاپیادہ گیا، پھر اس کے نام پر تحفہ پڑھنے اور خیرات و مبرات جاری کرنے کیلئے احکام صادر کئے[3]،

---

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ ج۱ ص۲۲۸ و معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ ص۲۷۰ اس کتاب پر ایک مضمون معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ میں نکل چکا ہے، منشی احمد علی شوق مرحوم سابق مہتمم کتب خانہ رامپور کا خیال ہے کہ بختاور خان نے ابتداءً صرف بابر سے عالمگیر کے حالات لکھے، اور اوس کا نام آئینہ بخت رکھا، پھر اسی کو وسعت دیا، اور اوس کو مرآۃ العالم سے موسوم کیا، اور اس کا تاریخی نام آئینہ بخت باقی رکھا، لیکن برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات کے مرتب نے اس تالیف مرآۃ العالم کو شیخ محمد بقا (سنہ ۱۰۳۷-۱۰۹۴ھ) کی تالیف قرار دیا ہے، البتہ اسکو بختاور خاں ہی کی طرف منسوب کرتا ہے، مآثر الامراء کا مصنف بھی اس کتاب کو بختاور خاں ہی کی تصنیف سمجھتا ہے،

[2] ...

[3] مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۰۹۵ھ،

ہمت خاں میر عیسیٰ، اسلام خان بدخشی کا لڑکا تھا، عالمگیر نے ایام طفلی میں اوس کی تعلیم و تربیت اپنی زیر نگرانی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جوان ہو کر مجمع فضل و کمال ہوا، مآثر الکرام میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"از مبادی نشو و نما بل در سن صبا بعنایت و الطاف خلد مکان سرفراز بود، و بنوازش تربیت آن شاہ ستودہ شیم ممتاز مجموعہ بود در قابلیت و کمال، نسخہ بود از فضائل خصائل پیوستہ ملاذ علماء دقیقہ طراز و مرجع سخن فہمان نکتہ پرداز، سلیم النفس نیک ذات کریم الاخلاق خیر خواہ کائنات، ارباب علم و ہنر از ہر باب در محفلش باریاب و کامیاب، طبع موزوں داشت[1]"

ہندی میں بھی شاعری کرتا تھا، امیرن تخلص تھا[2]،

ملا شفیعائی یزدی، ایران سے فضل و کمال حاصل کرکے شاہجہاں کے وقت میں ہندوستان آئے، شاہجہان نے ان کی استعداد و لیاقت دیکھکر مورد لطف و کرم بنایا، اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مامور کیا، ہزاری منصب سے سرفراز ہوئے، پھر بخشی گیری دوم کا عہدہ اور دانشمند خان کا خطاب عطا ہوا، ترقی کرکے میر بخشی گری اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب پر فائز ہوئے، عالمگیر نے انکو اپنے عہد میں پنجہزاری کا منصب عطا کیا، اور قلعۂ شاہجہاں آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے، سنہ ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوئے،

مآثر الامراء کا مصنف ان کی سوانح کے سلسلہ میں لکھتا ہے :-

"آن امیر ستودہ شیم از کبار فضلاے زمانہ بود، بنیک نفسی و نیک اندیشی مشہور، پس از و تا حال از نوئینان بلند مقدار کسے کہ فضیلت را با مارت جمع کردہ باشد، در عرصۂ روزگار نمایاں نہ شدہ[3]"

سید سعد اللہ، شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، پینتیس سال تک اپنے نانا سے درس لیتے رہے، علوم عقلی و نقلی، ریاضی و سلوک حاصل کرکے بیت اللہ کی زیارت کو گئے، جہاں بارہ سال تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ

---

[1] مآثر الامراء، جلد ۳ ص ۹۴۶، [2] ایضاً، [3] ر جلد ۲ ص ۳۲،

جاری رکھا، شریف مکہ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آتا تھا، بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ہندوستان آئے، اور بندر سورت میں قیام پذیر ہوئے، عالمگیر کو جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا، تو ان کی مدد معاش کے لئے دو گاؤں اور ایک مکان خانقاہ کے لئے دئیے، اورنگزیب کو ان کی ذات سے بہت عقیدت تھی، دور ہی سے ان کو خط لکھا کرتا تھا،[۱]

خافی خان نے منتخب اللباب جلد دوم میں عالمگیر کے عہد کے بعض اولیا و بزرگان دین کے حالات لکھے ہیں، جو صوری و معنوی حیثیت سے مجمع فضل و کمال تھے، اور جنسے عالمگیر روحانی حیثیت سے بہت زیادہ وابستہ تھا، اکثر ان کی زیارت کے لئے بنفس نفیس حاضر ہوتا تھا، ان کا ذکر یہاں پر مناسب نہیں معلوم ہوتا،

ہندو فضلاء و شعراء، عالمگیر کی سرپرستی نہ صرف مسلمان فضلاء و شعراء تک محدود رہی، بلکہ اوس نے ہندو اہل علم و کمال کو بھی اپنی فیاضیوں کا رہین بنایا، ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر دس کا بادشاہ بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب ہی کے سایہ عاطفت میں بڑھا، اسی کے توسل سے بھوشن کوی مغل دربار میں دہلی پہنچا، اور وہاں عرصہ تک رہا، گرئیرسن اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتا ہے، کہ "سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے فن اور علوم کا دلدادہ نہ تھا، لیکن (ہندی کے ہندو) شعراء دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے، اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ رہے،" اسی حقیقت کو مولانا شبلی اس طرح واضح کرتے ہیں "عام خیال یہ ہے، کہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جسقدر اس کے زمانہ میں توجہ کی، پہلے نہیں کی"[۲]

عالمگیر کے مسلمان درباریوں میں علاوہ روشن ضمیر کے دانا[۳] اور عبد الجلیل بلگرامی بھاشا کے بہت ہی ممتاز شعراء تھے، اسی طرح ہندو درباریوں میں فارسی کے بہت ہی قابل قدر ادباء، شعراء، اور مورخین تھے جو شاہی

---

[۱] خافی خان جلد ۲ صفحہ ۵۴۵، [۲] مقالات شبلی حصہ دوم، [۳] انکی نسبت غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں "در نظم ہندی بسیار خوب گفتہ"

ابر لطف و کرم سے برابر سیراب ہوتے رہے، ان میں سے چند کے احوال ملاحظہ ہوں،[۱]

واقف کھتری، امرائے عالمگیری میں سے ایک کا وکیل تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی، کہ ان کو سن کر شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت و آفرین کہتا تھا،

رائے بندرابن، رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے ۳۰ سنہ جلوس شاہجہانی میں حسن خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دیا، اور رائے کا خطاب بخشا، لب التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسر داس، قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا، ۳۰ سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبد الوہاب کی خدمت میں تحصیل علم کرتا رہا، شاہی ملازمین میں منسلک ہو کر جودھپور کا امین مقرر ہوا، اس نے میدان جنگ میں کارنمایاں انجام دیا، تو دو بست و پنج صدی افسر مقرر ہوا، فتوحات عالمگیری اوس کی ایک علمی یادگار ہے،

بھیم سین کایستھ، شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیوں میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا، تو عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا، پھر قلعہ نالدرک کا قلعہ دار ہوا، دلکشا نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی،

سوجان رائے کھتری، پٹیالہ کا رہنے والا تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت صحیح اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی، اور عالمگیر کے نام سے معنون کی،

خوشحال چند، عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، تاریخ نادر الزمانی خوشحال کی بہترین تصنیف ہے،

---

[۱] یہ تمام حالات علامہ سید سلیمان ندوی کے محققانہ مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" سے ماخوذ ہیں،

اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی گئی، وہ عالمگیر کو بزم کرنے والے اصحاب و مورخین کے لئے بصیرت افروز ہے، امیرزا خان بن فخر الدین محمد نے شاہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تحفۃ الہند تصنیف کی، جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے،[1] ابوسعید الحسینی الرضوی الشیرازی نے ۴۳ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۱۲ھ میں ہند و علوم ہیئت و نجوم پر "نظام النجم" کے نام سے ایک کتاب لکھی،[2] شیخ فقیر اللہ نے ہندی موسیقی پر ۱۰۷۳ھ میں "راگ درپن" کے نام سے ایک رسالہ لکھا، شیخ فقیر اللہ عالمگیری علماء و امراء میں تھا، سیف خاں لقب تھا، موسیقی کا بڑا ماہر تھا، رسالہ ہذا فن موسیقی کی ایک مستند کتاب "مانک سوہل" کا ترجمہ ہے، جس میں بہت سے فوائد اضافہ کئے ہوئے ہیں،[3] اس عہد کی دو اور عجیب کتابیں ہیں، "مت اچھرا" اور "رد الکفر" دونوں ہندوؤں کے رسوم و عقائد پر ہیں، پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہے، جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا لکھنے والا لعل بہاری ولد کاہید سنگھ ہے، جو بجوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی کا متوسل تھا، لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ میں عالمگیر کو جن الفاظ اور خلوص و عقیدت سے یاد کیا ہے، وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لائق ہے،[4] دوسری کتاب رد الکفر ایک نو مسلم کی لکھی ہوئی ہے، جس میں ہندوؤں کے عقائد پر تبصرہ کیا ہے،[5]

مورخین — اورنگ زیب کے درباری مورخین کی تعداد زیادہ نہیں، وقائع و اخبار نویسوں کے علاوہ صرف ایک درباری مورخ منشی محمد کاظم تھا جس نے عالمگیر کی حکومت کے دہ سالہ واقعات عالمگیر نامہ میں لکھے منشی

[1] اس کتاب پر مولینا شبلی کا مضمون مقالات شبلی، ادبی جلد دوم میں ملاحظہ ہو، [2] اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ میں موجود ہے، [3] ماثر الامراء جلد دوم ص ۴۰، [4] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ لائبریری دہلی میں موجود ہے، اس پر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون معارف نمبر ۲ جلد ۲۳ میں ملاحظہ ہو،

[5] ایضاً

محمد کاظم، مرزا محمد امین منشی مصنف پادشاہ نامہ[1] کا لڑکا تھا، اس کے ادب و انشاء کے چند نمونوں کو دیکھ کر عالمگیر نے اسے اپنے عہد کے حالات لکھنے کے لئے مامور کیا، لیکن دس سال کے واقعات وہ لکھنے پایا تھا، کہ عالمگیر نے دربار کے محکمہ تاریخ نویسی کو تخفیف کر دیا، اس کی خاکسار طبیعت پسند نہیں کرتی تھی، کہ اس کے مفاخر و مکارم کی داستان گوئی کے لئے ایک سرکاری بزم قائم کرے، عالمگیر نامہ کے مقدمہ میں ہے:-

"چون بندگان حضرت اعلیٰ خاقانی بمقتضائے دانش خداداد و فطرت بلند و علو ہمت و وسعت حوصلہ ابقاء آثار ظاہر را در جنب محوان وقعتے نہ نہادہ تیاسیس مآثر باطن بیشتر توجہ داشتند بعد از تدوین واقعات دہ سالہ حکم حقیقت شیم صادر شد کہ گذارندۂ داستان مفاخر و مکارم محمد کاظم مصنف کتاب مستطاب عالمگیر نامہ من بعد وقائع را بقید کتاب در نیاورد و لہذا وہم بدان قدر اکتفا نمودہ"[2]

"ماثر عالمگیری" کا مصنف بھی اپنے دیباچہ میں اسی بات کو ظاہر کرتا ہے،

"واضح باد کتاب بلاغت نصاب والا خطاب عالمگیر نامہ متضمن وقائع دہ سالہ دولت ابد طراز ..... ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نگاشتہ خامہ بدائع نگار مرزا محمد کاظم سرآمد سخن سنجان نادر کار است و چون خدیو عالم صورت و معنی و واقف اسرار بلندی و پستی را تاسیس بنائے باطن مقدم بر اظہار آثار ظاہر بود راقم از تسوید ممنوع شد"

مگر آزاد اہل قلم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، اس عہد کی تاریخ برابر لکھتے رہے، ان میں سے بعض ہندو مورخوں نے اپنی تاریخیں عالمگیر کے نام سے معنون کیں، اور ان کو بہ تقریب ہدیہ دربار میں لیکر حاضر ہوئے،[3]

[1] مرزا محمد امین کا ذکر گذشتہ مضمون میں آچکا ہے، [2] مقدمہ عالمگیر نامہ ص ۵، [3] "عہد عالمگیری میں تاریخ نویسی" کے عنوان سے جناب سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین کا ایک مدلل مضمون معارف نمبر ۵ جلد ۳۹ میں ملاحظہ ہو،

مدارس　برنیر نے شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی زبانی ایک دلچسپ اور پرمغز تقریر نقل کی ہے[۱] جس سے اورنگ زیب کا تعلیمی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، لیکن برنیر کا بیان عموماً سنجیدہ اور وقیع نہیں ہوتا، اسلئے ہم اسکو نظر انداز کرتے ہیں، خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اورنگزیب نے یہ تقریر اپنے ایک استاد ملا محمد صالح سے کی تھی، جسکا نام ہمعصر مؤرخ تاریخوں میں کہیں نہیں آتا،

عالمگیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضاء یہ تھا، کہ وہ اپنی سلطنت میں اسکی ترویج ہر ممکن صورت سے کرے چنانچہ اسنے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے، لائق اساتذہ مقرر کئے، اور طلبہ کو وظیفے دیئے، عالمگیر نامہ کے مصنف کا بیان ہے،

"واز آنجا کہ توجہ خاطر دانش مآثر بترویج مراتب فضل و تاسیس معالم علم درجۂ قصویٰ دارد، در جمیع بلاد و قصبات این کشور وسیع فضلا و مدرسان را بوظائف لائقہ از روزینہ و املاک موظف ساختہ بشغل تدریس و تعلیم محصلان علوم گماشتہ اند، و برائے طلبۂ علم در ہر محولی و ناحیہ وجوہ معیشت درخور رتبہ و حالات و استعداد مقرر داشتہ و ہر سالہ بدین وجہ نیز از خزائن، احسان پادشاہانہ مبلغہائے معتدٌ صرف می شود، و از فیض مکرمت و افضال شہنشاہ ابر کف دریا نوال طالبان علم و کمال ہمت افزونی پذیرفتہ منشرح البال و مرفہ الحال بکسب و تحصیل علوم اشتغال می ورزند، و برکات و دعائے اجابت اقتران گروہ سرمایۂ بقاے این دولت آسمانی شکوہ می گردد،"[۲]

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے، اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں، اس کا حال مراۃ احمدی میں اس طرح درج ہے،

[۱] دیکھو وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ سید محمد حسین ص ۲۴۹. [۲] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۵-۸۶ انگریز مورخوں نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ اورنگزیب نے زراعت کو ترقی دیا، باضابطہ سڑکین بنوائیں، اور بے شمار مکاتیب و مدارس قائم کئے، (دکین۔ موغل امپائر)

"بنام کرمت خاں دیوان صوبہ صادر شد، چون حکم مقدس معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ ورس تعیین نمایند و طلب علم از میزان تا کشاف خوان باتصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بہمرسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ می دادہ باشند، درین والا سہ نفر مدرس در احمد آباد و پٹن و سورت و چہل و پنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد"[۱]

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپئے کے خرچ سے ایک مدرسہ کی عمارت بنوائی، عالمگیر نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے موضع سوندرہ پرگنہ سانولی و موضع سبھیلہ علمرگنہ کڑی وقف کیا، اور ساتھ ہی ساتھ دو روپیہ یومیہ محتاج طلبہ کے لئے بھی مقرر کیا،[۲]

[۱] مراۃ احمدی ص ۳۰۹ تاریخ فرح بخش مصنفہ محمد فیض بخش و مترجمۂ ولیم ہوئی سے نریندر ناتھ لا نے نقل کیا ہے، کہ اورنگزیب میزان کے پڑھنے والے طلبہ کو از منشعب پڑھنے والے کو ۲ ر شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والوں کو ۸ ر روزینہ دیا کرتا تھا،

[۲] مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۷۲، اورنگزیب گے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے بھی اساتذہ مقرر کئے، تاکہ اون کی صحیح تعلیم ہو، اون کے ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے، (مراۃ احمدی جلد ا ص ۲۷۰-۲۷۸) برنیر کے بیان کے مطابق اورنگزیب نے فرنگی محل لکھنؤ میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا،

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، حجم ۲۰۸ صفحے، قیمت للعہ،

"منیجر"

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر مقصود ولی الرحمن صاحب ام اے

(۴)

۱۲- مزید اعتراضات کا جواب،

پچھتاوے اور ملامتِ ذات کے احساسات کو جبری عقیدے کے مطابق ناقابلِ توجیہ سمجھا جاتا ہے، بعض فلاسفہ کے نزدیک تو یہ احساسات جبریت کے خلاف برہانِ قاطع ہیں، لیکن اگر یہ احساسات اخلاقیات کے لئے لازمی ہیں، تو کیا جبریت میں یہ جون کے توں باقی نہیں رہتے، ؟ جس طریقے سے زندگی کی ایک خاص صورت خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی، ترقی پذیر ہوئی ہے، اور اس کی توجیہ سے اس زندگی کی اصلی ذاتی قیمت و وقعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جسم انسانی کے سُست ارتقار کے نظریے کی وجہ سے اس جسم کے حسن میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی، اسی طرح جبریت کے عقیدے کے مطابق بدکار اتنا ہی بدکار رہتا ہے، اور نیکوکار اتنا ہی نیکوکار، قیمت کے متعلق ہماری تصدیقات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، بدکار اپنے عمل کو اچھا نہیں کہہ سکتا، وہ مجبور ہے کہ اپنی سیرت پر نفرین کرے، اگر وہ اخلاقاً روشن طبع ہے، تو وہ اپنے بُرے ماضی کو ناپسند کریگا، اور گذشتہ اور موجودہ ذات کی طرف سے بے اطمینانی تغیر کی ایک شرط ہے، جب تک کہ وہ موجود رہتی ہے، اسوقت تک گویا دوسری پیدائش کا ایک اصول برابر کارگر رہتا ہے، جس کی وجہ سے ایک حقیقی توبہ، بدی سے اجتناب اور نیکی کا انتخاب ممکن ہوتا ہے، لیکن یہ احساس صرف ہماری

زندگی کے تسلسل حال کے ماضی پر، اور مستقبل کے حال و ماضی پر انحصار، ہیں اور ان کی وجہ سے کام کرتا ہے، اگر یہ انحصار نہ ہو، اگر میں آج کل گذشتہ سے، اور کل آیندہ آج سے مختلف ہوں، تو ماضی کے جن تاسفات کا میں آج پھل پاتا ہوں، ان کے مہیا کئے ہوئے محرکاتِ اصلاح ذات، کوشش کی روز افزوں کامیابی جو عادت کا نتیجہ ہوتی ہے، اور ایک بہتر مستقبل کا یقین جو اس کوشش میں جان ڈالتی ہے، یہ سب ناممکن ہوجاتے ہیں،

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبری نظریے کے مطابق بدی کا مسئلہ حاشۂ اخلاقی کے لئے مکروہ ہوجاتا ہے کیونکہ اس عقیدے کو تسلیم کرلینے سے ہم مجبور ہوجاتے ہیں، کہ بدترین جرائم کو عالمی نظام کا لازمی عنصر سمجھیں، لہذا کہا جاتا ہے کہ خدا کو اخلاقی اور جسمانی بدی کا باربرداشت کرنا چاہئے لیکن کیا یہ صورت انسانی ارادے کے کسی عقیدے کو بھی تسلیم کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، ؟ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص بھی خود اپنے اعمال کی براہِ راست اور فوری ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ خالق عالم بھی اس عالم کا جسکو اس نے پیدا کیا ہے، ذمہ دار ہے، استدلال کی خاطر ہم مطاع الکل کے اس تخیل کو تسلیم کئے لیتے ہیں، جو زمانۂ ماضی کی دینیاتی دنیا میں بہت مقبول رہا ہے، اور جو اب بھی عوام کے تفکر میں عام طور پر مسلم ہے، اس تخیل کے باوجود یہ نتیجہ لابدی ہے کہ اگر ایسی ہستی انسانوں کو آزاد پیدا کرنے کا فیصلہ کرے، تو وہ اپنے اس فیصلے کے تمام عواقب و نتائج کی ذمہ داری سے اگر بچ سکتی ہے، تو صرف اس صورت میں کہ وہ عین اُن صفات سے دست بردار ہوجائے، جن کو مذہبی تفکر اس کی ماہیت میں داخل کرتا ہے، غیر محدود طاقت و علم اور محدود ذمہ داری کے تخیلات میں سخت تضاد ہے، کوئی نظریہ بھی اس تضاد کو تشفی بخش طریقے سے حل نہیں کرسکا، پھر ایک ایسی ہستی کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو ان تمام صفات سے متصف ہوکر بھی ایک ایسی دنیا پیدا کرتی ہے، جس میں بخت و اتفاق کا عنصر موجود ہے، اور جس میں اس اتفاق کے حسن اتفاق بننے کا اتنا ہی امکان ہے، جتنا کہ سوئے اتفاق بننے کا،[۱] پھر انسانی تجربے کے گھنے جال میں سے طبعی اور اخلاقی بدی کے ڈورں

[۱] مترجم کا مصنف کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں،

کو الگ الگ کرنا بھی ناممکن ہے، دنیا کو اخلاقی بدی کے بارے ہلکا کرنا، مسئلہ بدی کے حل، یا اس کو آسان کرنے کے ہم معنی نہیں، جن بدترین جرائم کو اختیاریت آزاد ارادے کی طرف منسوب کرتی ہے، وہ اُن تکلیفوں اور ذلتوں کی وسعت و شدت کے سامنے جو اور وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں، ہیچ ہو جاتے ہیں چنانچہ کوئی شخص بھی اتنا خبیث نہیں ہو سکتا، دنیا میں دردناک اور کریہ امراض پھیلا کر اسکو عمداً اور بالتواتر بدی میں مبتلا کرے، انسانی انتخاب میں جو بدی نظر آتی ہے، وہ دراصل ایک بڑے مسئلہ کا جزو ہے،

لیکن اسکو نہ بھولنا چاہئے کہ اختیاریت کے عقیدے کا اطلاق دونوں سمتوں میں ہونا چاہئے، اگر دینی بناپر خدا کو انسان کے برے انتخابات کے بارے ہلکا کرنے کے لئے اختیاریت میں پناہ ملتی ہے، تو انسان کے اچھے انتخابات بھی اس کی طرف منسوب نہیں کئے جانے چاہئیں، اگر انسانی فعل کے سب کچھ ہونے یا کچھ نہ ہونے کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے، تو نیکی کے بدی پر غالب ہونے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم مذہبی بنا پر مقدم الذکر ہی کا انتخاب کریں گے، یہ بات کہ ہم میں جتنی نیکی ہے، اس کا سرچشمہ بالآخر وہ طاقت ہے، جو ہم نہیں، ایک ایسا واقعہ ہے، جس کو ہر زمانے کے اچھے اور بُرے آدمیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے، جب ہم ان بدبخت ہستیوں کی شومئ قسمت پر غور کرتے ہیں، جن کے لئے بدی وراثتہً مقدر ہو چکی ہے، اور جن کے لئے ایک افسوسناک ماحول نے اس پیتے اور انتخاب کو یقینی بنا دیا ہے" تو ہم روشنی اور مدد کے لئے اس سرچشمہ کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، جس نے ہم کو ایسے ہی انجام سے بچایا ہے، ہمارا عمیق ترین شعور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا ہے "ہمارے لئے نہیں، ہمارے لئے نہیں" اب رہ گیا وہ مذہبی سوال، جو یہاں اس بحث میں پیدا ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو خدا اور دنیا کے ساتھ اس کے تعلق پر سرطریقے سے فکر کرنا سیکھنا چاہئے، ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خدا اپنے تمام انتخابات متقابل محرکات کی موجودگی میں کرتا ہے، یا یہ کہ وہ مجوزہ دنیا کے سامنے اسی طرح کھڑا ہوتا ہے، جس طرح ایک کاریگر اپنی بنائی ہوئی چیز کے سامنے،

جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے، جبریت اس کا عقیدہ نہیں، یہ ہر اُس شخص کو بدی سے نجات پانے کی امید

دلاتی ہے، جو سیکھنے کے قابل ہے، اور زندگی کے تجربوں سے عقل حاصل کر سکتا ہے، ہمت صرف اسوقت ٹوٹتی ہے، اور اخلاقی قوت صرف اسوقت غائب ہوتی ہے، جب ذات پر قسمت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جبریت اخلاقی زندگی کے بعض اہم عملی پہلوؤں پر زور دے کر محرک عمل مہیا کر سکتی ہے، عمل پر لازمی تعلق کے اصول کے اطلاق کا ایک نتیجہ یہ ہے، کہ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر بعد کا فعل، قبل کے افعال سے اس طرح ملا ہوا ہے، جس سے عادت کی اہمیت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے، ہر بعد کے انتخاب میں اس شخص کی تمام گذشتہ زندگی بروئے کار آتی ہے، لہذا موجودہ اخلاقی فعل کا مفہوم اور گہرا ہو جاتا ہے، میں جو کچھ آج کرتا اور سوچتا ہوں، وہ میرے کل کے کرنے اور سوچنے کے لئے بہت گہرے اثرات رکھتا ہے، اگر یہ صحیح ہے، کہ کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا، تو یہ بھی صحیح ہے، کہ کوئی علت بغیر معلول کے نہیں ہو سکتی، لہذا کسی جادو کے زور سے نہیں، بلکہ بالکل طبعی اور لازمی طریقے سے یہ خیال ترازو کے اس پلڑے کو جھکا سکتا ہے، جس میں وہ موجود انتخابات تولے جا رہے ہیں، یہی یقین کہ ہم اس طرح معین ہوتے ہیں، بذات خود ہم کو بدی سے روک کر نیکی اختیار کرنے میں مدد دیکستا ہے، اس تعلیم کے عمرانی نتائج بھی کچھ کم وقیع نہیں، اس طرح ہر عمرانی فعل ایک نئے معنی کسب کر لیتا ہے، عمرانی تعلقات کی ذمہ داری سے کون بچ سکتا ہے، ہمارے افعال خالی خولی ہماری طرف عود نہیں کرتے، بلکہ انسانی تاریخ کے اس بڑے جال میں یہ تمام افعال ایک ایسی طاقت سے کام کرتے ہیں، جس کی صحیح وسعت کو ہم جانچ نہیں سکتے، لیکن ان کو ناگزیر سمجھنا ہی پڑتا ہے،

۱۳- ذمہ داری سزا،

مندرجۂ بالا تمام بحث میں ہم نے آزادی کی ایک نئی تاویل کی ہے، جس کے نہ صرف نظری، بلکہ عملی مقاصد بھی مقتضی تھے، یہ صحیح ہے کہ تعلیم، سزا، حکومت، عمرانی جد و جہد وغیرہ تمام معاملات میں عوام کا تفکر جبریت کے مطابق ہوتا ہے، لیکن بہ لحاظ صورت یہ اختیاریت کے قریب ہوا کرتا ہے، یہ صورت حال کچھ شعور کے فتووں کی غیر ناقدانہ تخمین کا نتیجہ ہے، اور کچھ بعض ان نظریات کا جو قانون اور دینیات میں عر

سے جاری ہیں، لہذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ عوام کا تفکر خود اپنے سے متناقض ہے، اب اخلاقی نظریہ یا تو نا قابلِ برداشت تنازع کو تسلیم کرے، یا ان کو دوبارہ شکل دیتے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے، اخلاقی تفکر کا یہ کام نہیں کہ تجربے کی ٹھوس زمین کو چھوڑ کر ہوا میں معلق ہو جائے، عملی معاملات میں فہم عامہ کی تصدیقات کی تردید بھی اس کا مقصد نہیں اعمال کی نئی صورتوں کی تخلیق بھی اس کا اولیں وظیفہ نہیں، بلکہ اس کا اصلی کام پہلے سے موجودہ صورتوں کی توجیہ ہے، اخلاقی نظریہ کسی چیز کو مٹاتا نہیں، بلکہ اس کی تاویل کرتا ہے، زیر بحث سوال میں یہ فہم عامہ کی اختیاریت کے مرکزی معنوں کی تردید نہیں کرتا، اور آزادی اور ذمہ داری کے لئے حقیقی اخلاقی مفہوم کے تحفظ کے یہی معنی ہیں، ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جبری نظریے کے مطابق اخلاقی آزادی ایک بے معنی نصب العین نہیں، بلکہ ایک حقیقی واقعہ ہے، جس کے ساتھ واضح معنی شریک ہو سکتے ہیں؛ آزادی ایک غیر معین ارادے کے ہم معنی نہیں، یہ ایسے ارادے کے مساوی ہے، جسکو فہم و بصیرت نے معین کیا ہے، اب ذمہ داری کے مسئلے پر مختصر بحث باقی ہے۔

صفائی کی خاطر ہم اس بحث کو اخلاقی مسئولیت، یا ذمہ داری کے بجائے طبعی مسئولیت کے تخیل سے شروع کر سکتے ہیں، ان معنوں میں مسئولیت عمیم الاطلاق ہے، چنانچہ ان ہی معنوں میں ہم ایک شہر میں گندے پانی کے استعمال کو وبا پھیلنے، اور کسی ملک کی آب و ہوا، وہاں کے باشندوں کی خصوصیات کا ذمہ دار کہتے ہیں، اسی طرح فصل کی خرابی کسی خاص قسم کی گھاس کے نکلنے کی طرف منسوب کیجاتی ہے، مجنوں اپنے تشدد کا جواب دہ ہوتا ہے، اور احمق اپنی بدتہذیبی کا، اس استعمال میں اس اصطلاح کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ زیر بحث شخص یا چیز بعض حالات یا واقعات کا بلا واسطہ سرچشمہ ہے، یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی ہستیاں بھی ان ہی معنوں میں اپنے افعال کے جواب دہ ہوتی ہیں، یعنی ان کو ان افعال کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ باہم لازم مربوط واقعات کی دنیا میں کوئی چیز بھی اپنی فطرت و ماہیت کے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتی، گندا پانی صاف نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح بیماری پیدا کرنے والی ہوا صحت بخش

نہیں کہلاتی، جو گھاس فصل کو خراب کرتی ہے، اسکو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے مجنوں پاگل خانے میں بند کر دیا جاتا ہے، اور احمق کو اس کی حماقت کی سزا ملتی ہے، جن لوگوں کو اندیشہ ہو کہ ذمہ داری کی نئی تاویل اخلاقی نظام کی بیخ کنی کرے گی، ان کو طبعی مسئولیت کے نقطۂ نظر سے بھی مطمئن رہنا چاہئے، سوسائٹی اپنے افراد کو ان کے افعال کے مطابق جانچتی ہی رہے گی، جو شخص عمرانی بدی پھیلائے گا، اسکو بدی کا سرچشمہ ہی کہا جائیگا اور وہ اپنے افعال کا جواب دہ رہے گا،

لیکن اس بات سے سب اتفاق کرین گے، کہ اخلاقی ذمہ داری میں اُس جواب دہی یا مسئولیت کے علاوہ اور بہت کچھ شامل ہے، جس پر اب تک غور ہو چکا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو انسان اور درخت یا حیوان کی ذمہ داری میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، وہ کونسا عنصر ہے، جس سے اخلاقی ذمہ داری مرکب ہوتی ہے، ہم یہاں فہم عامہ کے جواب کو تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے، کہ فہم عامہ کو مجبور کرنا چاہئے، کہ وہ ان معنوں کو محض بیان کرنے کے علاوہ ان کی توضیح بھی کرے، فہم عامہ کا جواب بلاشبہہ یہ ہوگا، کہ انسان صرف اس وجہ سے اخلاقاً ذمہ دار ہے، کہ وہ آزاد ہے، اور یہ صحیح بھی ہے، بہ شرطیکہ ان اصطلاحات کے صحیح معنی لئے جائیں، لیکن اس موقع پر پھر ہم کو ایک آزاد شخص کے تمیزی نشان کی تلاش کرنی پڑتی ہے، ہم کو ایک ایسی خصوصیت درکار ہے، جو آزاد انسان، اور غیر آزاد اشیا یا اشخاص، مثلاً درخت، حیوان، مجنوں، احمق اور بچے میں ما بہ الامتیاز ہو، یہاں فہم عامہ بلا تامل انسان کی عقل، اور اس کی تدبر کرنے والی اور ذی عقل فطرت کی طرف اشارہ کرے گی، جن کی وجہ سے وہ تصورات کو وصول کر سکتا ہے، اور تربیت سے متاثر ہو سکتا ہے، اور جن کی وجہ سے وہ خود اپنی رہنمائی کرنے والا فاعل بن سکتا ہے، لیکن اس کا مطلب ہے، کہ انسان کے افعال غایت کے تصور کے مطابق یعنی محرکات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور یہی اسکے افعال کو معین کرتے ہیں، ہم سے کہا جاتا ہے کہ مجنون اور احمق ذمہ دار اس وجہ سے نہیں ہوتے، کہ وہ تربیت پذیر نہیں وہ تصورات کو وصول نہیں کر سکتے، اور محرکات ان کی تعیین نہیں کر سکتے، پھر اس پر بھی اتفاق کیا جائے گا،

کہ تربیت پذیری اور محرکات سے رہنمائی کی یہ قابلیت ہی ذمہ داری کے درجے کو معین کرتی ہے، یہی بچپن میں روز افزوں ذمہ داری کے مختلف درجوں کی نشان دہی کرتی ہے، یہی ذمہ داری کے ان درجوں کی پیمائش کرتی ہے جو ہم مختلف سقیم یا فاسد اصناف کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور قانونی نقطۂ نظر سے بھی یہی ذمہ داری کا معیار ہے، اس اصول میں کوئی استثنا نظر نہیں آتا، یا لو جانوروں کے ساتھ جو سلوک ہم کرتے ہیں، اس میں انسانی ذمہ داری کی دلچسپ شبیہہ دکھائی دیتی ہے، ان کو ہم ان کے عقل اور تربیت پذیری کے درجے کی مناسبت سے ذمہ دار سمجھتے ہیں،

لیکن اس کے بعد یہی کہا جائے گا کہ امتحانی نکتہ تو ابھی جوں کا توں باقی ہے، کیا ہم انسانی افعال کو لازمی اور جبری کہنے کے باوجود انسان کو ذمہ دار گردانیں گے؟ اس کا جواب فہم عامہ کی تصدیقات کے مطابق بھی غیر مشتبہ ہے، اور فہم عامہ کی انہی تصدیقات کی روشنی میں ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ ہم ایک شخص کو اس کے لازمی اور جبری افعال کا ذمہ دار گردانتے ہیں، بشرطیکہ یہ لزوم جبر خود اس کی فطرت کی طرف سے ہو، نہ کسی اور خارجی طاقت کی طرف سے، اور یہ کہ یہ فطرت محرکات کے تعیینی اثرات کی وجہ سے قابل اصلاح ہو، معمولی انسانوں کے عام افعال میں یہ شرائط بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، ایک گرم مزاج اور زود رنج باپ اپنے بچے میں گرم مزاجی اور زود رنجی کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ وہ بچہ خود اس کا اوتار ہے لہذا وہ اس تمام حالت کو ایک ایسے موروثی میلان کا بالکل طبعی اور لازمی اظہار خیال کرتا ہے، جس کے خلاف خود اس نے تمام عمر جہاد کیا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بچہ کو پوری طرح ذمہ دار گردانتا ہے، تجربے سے باپ نے اس گرم مزاجی اور زود رنجی کی برائیوں اور حماقتوں کو معلوم کر لیا ہے، اور وہ بچے کو اس کے کسی اور فعل کے مقابلہ میں اس فعل کا زیادہ ذمہ دار گردانتا ہے، کیونکہ اسکو یقین ہو کہ تربیت وتادیب بے اثر نہ رہے گی، یہ خیال غلط ہے کہ اگر ہم کسی فعل کو لازماً متعین یا معلومہ حالات میں ناقابل تغیر سمجھتے ہیں، تو اس کی مسئولیت ختم ہو جاتی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ ہم اپنے آپ کو عین اون

افعال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، جو خود ہماری فطرت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، اور جن کو ہم خود اپنی سیرت کے کسی تعیین کرنے والے عنصر کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، بقول گرین "اگر کسی شخص کا فعل اس کی سیرت کو نہیں، بلکہ بلا محرک ارادے کی کسی ناقابل توجیہ قوت کو ظاہر کرتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسکو اس پر شرم آئے، یا وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرے" جن مثالوں میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ، فہم عامہ یا قانونی عدالتوں کے نزدیک بہت کم ہوتا ہے، وہ وہ ہوتی ہیں، جن کو فاعل کی اپنی سیرت متعین نہیں کرتی، یا جن میں کسی خرابی کی وجہ سے اس سیرت پر محرکات کا اثر نہیں ہو سکتا، آزادی کا جو عقیدہ آزادی کو خود تعیینی کے ساتھ متحد قرار دیتا ہے، اس کی تائید میں قوی ترین دلائل میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے، کہ اس کے ذریعے سے ہم اخلاقی ذمہ داری کے واقعات کی تاویل روزمرہ زندگی کی صحیح اخلاقی تصدیقات کے مطابق کر سکتے ہیں، یہ تصدیقات جس نظریے کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، گو اُن کے مطابق یہ غلط ہوتی ہیں، لیکن عملاً انکی صحت غیر مشتبہ ہے،

سزا کے اخلاقی پہلو، زیر بحث مسئلے کے تعلق سے اتنے اہم ہیں، کہ اس موقع پر ان کا ذکر بھی ضروری ہے، اگر سزا کسی شخص کے لئے کوئی اخلاقی قیمت رکھتی ہے، اور وہ محض عمرانی حفاظت کا طریقہ نہیں ہے، تو اُن پیچیدہ ذہنی حالات میں بصورت تعیینی عنصر اس کے داخل ہونے کے امکان ہی سے اسکے حدود مقرر ہو جاتے ہیں جن سے فاعل کے آیندہ افعال صادر ہونے والے ہیں، جزا و سزا کا جواز صرف اسی لئے ہے، کہ اس کی وجہ سے محرکات بروئے کار آتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں، اختیاری عقیدے کے مطابق یہ دونوں اسی حد تک بے اثر ہیں جس حد تک کہ اختیاریت صحیح ہے مختصر یہ ہے کہ معین و مجبور ارادہ ہی وہ ارادہ ہے، جو اخلاقی تعلقات میں کام آسکتا ہے،

لیکن ظاہر ہے کہ سزا کی ایک صورت مندرجۂ بالا بیان سے مستثنیٰ ہے، اور وہ یہ انتقامی سزا ہے جس سے مظلوم کی تشفی ہوتی ہے، اور جس میں نتائج و عواقب ملحوظ نہیں رہتے، اگر سزا بدکار کی اصلاح

یا سوسائٹی کی حفاظت میں کارگر نہیں ہوتی، تو اس کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، اور وہ محض بیکار اور خبیثانہ ایذا رسانی بن جاتی ہے، سزا سے انتقامی عناصر کو خارج کر دینے کا روز افزوں میلان اخلاقی ترقی میں بہت اہم کڑی ہے، جس سزا میں یہ انتقامی عنصر داخل ہے، وہ ہر شخص کے لئے انسانیت سے معرا کرنے والی ہے، اسلئے زمانۂ وحشت کی اور چیزوں کی طرح اسکو بھی مٹ جانا چاہئے، انسانی فعل کی جبری توجیہ کے بہترین اثرات میں سے ایک اثر یہ بھی ہے، کہ اس سے اپنے ابنائے جنس کی ہمدردی پیدا ہوتی ہے، عمل کے گہرے سرچشموں کا سمجھنا ہر حقیقی و صحیح رحم کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ہر عادلانہ ممانعت کے لئے، اگر اس رحم میں انسان کی برائیاں اور حماقتیں بھی شامل ہوں، تب بھی یہ خطرناک یا مشفقانہ رحم نہیں بنتا، کیونکہ یہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے، کہ عمرانی نظام میں ایسے مؤثر محرکات کام کر رہے ہیں، جو بدی کو روکتے ہیں، اس لئے وہ ایک ہاتھ تو کمزوروں اور خطاکاروں کے ساتھ ہمدردی کی طرف بڑھاتا ہے، اور دوسرا ان کی سخت روک تھام کی طرف،

۱۴- جبریت کا خیال زندگی کی طرف،

آخر میں آزادی اور ذمہ داری کی اس تاویل کے عملی نتائج پر غور کرنا بہتر ہوگا، جو ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کئے ہیں، یہ بلاشبہ صحیح ہے، کہ کوئی محتاط فکر کرنے والا شخص کسی نظریے کے فوری عملی اثر کو اس کی نہائی صداقت کا معیار نہیں مانتا، تاہم کو اس سے انکار کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے، کہ تاریخی حیثیت سے عقلی غلطی نے بعض اوقات بڑے اچھے نتائج پیدا کئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خطا صواب کے برابر مفید ہے، اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی ارتقا کے ایک خاص درجے میں کسی مسئلے میں عقیدے کی غلطی دوسری مروجہ غلطیوں اور علم کی مجموعی حالت کے ساتھ ایسا اچھا توازن رکھتی تھی، کہ صداقت و صواب نہ رکھ سکتے تھے، پھر اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ غلطی نفس اپنے نقائص اور کمزوریوں کی وجہ سے نہایت عمدہ عملی محرک بن گئی، اعلیٰ قسم کی شہادت کے لئے یہ محرکات بالکل غیر مؤثر ہوجاتے ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ غلطی کی آخری خوبی کے خلاف

ہمارے ایقانات و اذعانات صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک کا ایمان ہے، اور اسکی تائید میں کافی شہادتیں ہیں، کہ صواب کو جاننا اور اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن قصہ یہ ہے کہ اختیاریت نے جبریت کو اس کے مفروضہ عملی نتائج کی بنا پر رد کیا ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس مناقشے کا بھی فیصلہ کرلیا جائے، اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے، کہ اخلاقیات میں ہم نظریۂ عمل پر بحث کرتے ہیں، لہذا اگر یہ معلوم ہوجائے، کہ یہ نظریہ ایسا ہے جس کے مطابق انسان زندگی بسر نہیں کرسکتا، یا یہ اعلیٰ اخلاقی جد وجہد کے لئے مہلک ہے، تو پھر یہ نظریہ مہلک طور پر عیب ناک ہوجاتا ہے، اب سوال دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانی عمل کی اس تاویل کے نتائج کیا ہیں، ایک عقیل اور فہیم شخص اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کریگا؟ بلاشبہ وہ کوئی نامناسب خاطر جمعی، یا فخر محسوس نہ کریگا، اگر وہ اپنے آپ میں کوئی اچھی، یا قیمتی چیز پائے گا، تو وہ یہ بھی معلوم کرلے گا، کہ ان کا سرچشمہ خود اس کا پیدا کردہ نہیں، بلکہ وہ عالمی نظام کی کسی گہرائی میں پوشیدہ ہے، بصیرت کی ہر خفی قوت، سیرت کی ہر اطمینان بخش و مسرت انگیز میزان، عروج پانے کا ہر ہیجان ہر جگہ اس چیز کی شناخت کرے گا، جو اس کے لئے ایک تحفہ ہے، پھر احول کی ان ہزاروں قوتوں کو بھی وہ ایسا ہی سمجھے گا، جن سے اس نے اپنی تقدیر بنائی ہے، اسلئے جب وہ اپنا مقابلہ اپنے اس ہمنشین سے کرے گا جس کو غلطی نے اندھا بنا دیا ہے، اور جو بدی کا غلام ہے، تو اسکو معلوم ہوگا، کہ اس تحفے کی غیر موجودگی میں وہ بھی اتنا ہی مصیبت زدہ ہوتا، اگر وہ اس بدی کو، جو وہ اپنے آپ میں پاتا ہے، اسی نگاہ سے دیکھتا ہے، تو اس کا یہ عقیدہ اس بدی کی سنگینی کو کم نہیں کرسکتا، اور نہ حصول کمال کی کوشش میں اس کی وجہ سے کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے، وہ اس دردناک تربیت و تادیب کو جو خود اس کی اپنی حماقت اور خطاکاری کا نتیجہ ہے، اپنی صلاح و فلاح کی لازمی شرط سمجھے گا، اور اس کو ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہوگا، اپنے ہمنشینوں کے ساتھ اسکو گہری ہمدردی ہوگی، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ایسی فطرتوں کے حامل ہیں جن کو خود انھوں نے منتخب نہیں کیا ہے، اور اگر اس ہمدردی کی وجہ سے وہ زندگی کے طربیہ و حزنیہ پر ہنستا اور روتا ہے، تو اس کی ہنسی طنز سے اور اس کا رونا تلخی سے پاک ہوگا، لیکن ایک ہر دم تیار ہمدردی کی وجہ سے وہ

نہ تو منصفانہ مطالبوں کو پورا کرے گا، اور نہ اپنے ہمنشینوں کی ذمہ داریوں کو کم کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ امید و بیم کے مناسب محرکات ہی ان کو ان کی بہترین کوششوں پر ثابت قدم رکھ سکتے ہیں، اگر اس سے انصاف کرنے یا سزا دینے کو کہا جائے گا، تو وہ نہ رحم کھائے گا، اور نہ کمزوری دکھائے گا، وہ ہاتھ باندھکر کسی خارجی قسمت کی طرف سے فیصلہ صادر ہونے کا انتظار نہ کرے گا، کیونکہ اسکو معلوم ہے کہ اسکے دل میں ارادہ فعل کی حرکت بیکار نہیں ہے، اور یہ کہ اپنی طاقت اور اپنے علم کے مطابق اسکو بھی اس دنیا کے ڈرامے میں اپنا پارٹ کرنا ہے، آخری بات یہ ہے کہ ایسا شخص نوع انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہ ہوگا، کیونکہ وہ گذشتہ زمانہ کی ترقی کو دیکھ چکا ہے، وحشیانہ زندگی سے جو بہیمانہ زندگی سے یونہی سی مختلف تھی اس نے آہستہ آہستہ یہ تمام وقعت حاصل کی ہے، اس نے علم حاصل کیا، جس سے جہالت اور توہمات کا خاتمہ ہوا، اس نے ہمدردی پیدا کی جو انانیت اور نفرت کی ہلاکت کا باعث ہوئی، اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں غیر متزلزل شجاعت کا اظہار کیا، اس نے اعلیٰ غایات کے حصول کی کوشش میں بلند نظری کا ثبوت دیا، ان تمام اکتسابات و کمالات کے بعد اب وہ یقین کر سکتا ہے، کہ جو طاقت اس طرح انسانی نوع میں کام کرتی رہی ہے، وہ اور زیادہ بلند نتائج پر ختم ہوگی،

(نئی کتاب)

مقالاتِ شبلی جلد ششم تاریخی

یعنی

یہ حصہ مولینا شبلی مرحوم کے اون تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جسمیں اسلامی حکومتوں کی تمدن و تہذیب علم و فن، شوقِ علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخون کے اعتراضات کے جوابات دئیے گئے ہیں، حجم ۲۴۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

کتبخانۂ حبیب گنج کے فنِ تاریخ کے چند نوادر،

از

جناب عبد الغفور صاحب بی اے آنرز لندن ایم اے ایم ایس سی علیگ،

نواب صدر یار جنگ بہادر کا کتبخانہ نوادر کتب کا انمول ذخیرہ ہے، ان میں سے چند تاریخی نوادر پیش کیجاتے ہیں،

۱- **دول الاسلام** مع ذیل دول الاسلام للامام ذہبی، یہ نسخہ امام ذہبی کی ضخیم تصنیف تاریخ الاسلام کا اختصار ہے، جو مصنف نے خود تیار کیا تھا، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مختصر تالیف ہے، اسکی ترتیب سنہ کے لحاظ سے ہے، اور سنہ ۷۴۴ھ تک کے حالات اس میں درج ہیں، اس کے بعد سخاوی کی ذیل ہے، جو سنہ ۷۴۱ھ سے سنہ ۹۰۱ھ تک ہے، یہ ذیل بھی اصل کتاب کی طرح مختصر ہے، اور اس کا نام ذیل التمام بدول الاسلام رکھا گیا، دول الاسلام دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے سنہ ۱۳۳۷ھ میں شائع ہو چکی ہے، یورپ کے علمی حلقوں میں بھی کچھ عرصے سے امام ذہبی کی تصنیفات بالخصوص تاریخ الاسلام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے، تاریخ الاسلام کی ۱۲ اور بقول بعض ۲۰ جلدیں تھیں، اور آج کل اس کے ناقص اور غیر مکمل اجزا مغربی اور مشرقی کتب خانوں میں منتشر پڑے ہیں، ڈاکٹر سپیز استاد علوم عربیہ علیگڈہ نے جامع ایا صوفیہ کے قابلِ قدر نسخون کی طرف توجہ دلائی، اور سنہ ۱۹۳۲ء کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سموگی کے قلم سے ایک مضمون نکلا تھا، جس میں تاریخ الاسلام کے مختلف پریشان اجزاء کو یکجا کرکے شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی،

حبیب گنج کا نسخہ آغاز سے خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک ناقص ہے، خط عربی عتیق اور کاغذ عربی ہے، سنہ ۲۶۹ھ کے حالات کے بعد چند اوراق الحاقی ہیں، اس کے بعد اختتام کتاب تک اصل کاتب کے ہاتھ سے منقول ہے،

اخیر میں کاتب لکھتا ہے، ما وجد بخط الحافظ ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد الذہبی رحمۃ اللہ من ذیل علی کتاب دول الاسلام، چونکہ یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے نقل کیا گیا ہے، اسلئے بہت اہم ہے، کتابت یوم السبت ماہ جمادی الآخرہ ۹۷۰ھ کو ختم ہوئی،

مولینا موصوف نے فہرست میں لکھا ہے، کہ یہ کتاب مولینا شبلی مرحوم کی عنایت سے دستیاب ہوئی،

۲- **النور السافر من القرن العاشر** - اس کتاب میں مصنف نے قرن دہم کے علما صلحا، ادبا، فرمانروا اور امرا کا ذکر ہر ایک کے سنہ وفات کے ضمن میں کیا ہے، آغاز ۹۰۱ھ سے کیا ہے، اسلامی دنیا کی عالمگیری کا دلچسپ مرقع ہے، اور شامی و حجازی، مصری و یمنی، رومی و ہندی، مشرقی و مغربی سب ممالک کے مشاہیر و اہل کمال کا ذکر درج کیا ہے، ہر ایک کے ضمن میں ان کی حکایات عجیبہ اور دلچسپ چٹکلے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں، مثلاً ۹۷۴ھ کے حالات میں سلطان سلیمان آل عثمان کی وفات کا ذکر کیا ہے، اور اس حادثہ پر ایک مرثیہ بھی تحریر کیا ہے، کتاب کے متن میں کہیں کہیں مصنف کے آبا و اجداد کے سنہ وفات اور سوانح حیات کا حال بھی آیا ہے، ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے چند امور اہم پائے گئے، اولاً صفحہ ۴۵ پر دسویں صدی کے پانچویں سال میں ایک ہالۂ عظیمہ کا ذکر ہے، جو سورج کے گرد نمودار ہوا اور چاشت کے وقت سے ظہر اور عصر کے درمیانی وقت تک رہا، اس کے بعد غائب ہوگیا، شہر احمد آباد پر ایک علحدہ باب لکھا ہے اس میں سلطان محمود شاہ ابن مظفر شاہ کا حال ہے جو احمد آباد میں فوت ہوا، اس شہر کے متعدد علما و ادبا کے حالات زندگی زیب قرطاس کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان میں سے بیشتر مصنف کی حیات میں ہو گذرے ہیں اس لحاظ سے یہ تذکرہ تاریخی لحاظ سے بہت وقیع ہے، بقول پروفیسر عبد العزیز میمن اس کا ایک نسخہ کتب خانہ فرنگی محل میں بھی موجود ہے، مصنف کا نام شیخ عبد القادر بن شیخ العیدروس الہندی، متوفی ۱۰۳۸ھ بخط نسخ مؤلف نے اس کتاب کی تصنیف سے ۱۰۱۲ھ ہجری میں فرصت پائی، سنہ کتابت ۱۰۹۳ھ ہجری،

۳- **اقبالنامۂ جہانگیری**، یہ معتمد خان امیر عہد جہانگیری کی مشہور تاریخ ہے، اور تینوں جلدوں کا مکمل نسخہ ہے، اسکی پہلی اور دوسری جلدیں بقول ریو اور ایتھے کمیاب ہیں، تیسری جلد تصحیح کے بعد کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے، اس کا اردو ترجمہ دار الترجمہ حیدر آباد نے چھاپا ہے، یہ نسخہ خوشخط فارسی جلی قلم سے لکھا گیا ہے، عنوان مطلا و لاجوردی، اول سے آخر تک تمام اوراق سنہری جدولوں سے گھرے ہوئے ہیں، ابتدا کے ورق تو بالکل مطلے ہیں، ہر ہر سطر کو سونے سے معمور کیا گیا ہے، اسکی تذہیب و آرائش شاندار اور عظیم القدر، اس نسخہ کی ایک خاص چیز جو دوسرے قلمی نسخوں میں نہیں پائی جاتی شجرہ سلاطین مغلیہ ہے، جو قبل آغاز کتاب لکھا ہوا ہے، ہر ایک نام زرین حلقے میں ہے حاشیہ کے نام بھی حلقۂ زریں میں تحریر کئے گئے ہیں،

۴- **تذکرۃ الخوانین** مؤلفہ شیخ فرید بن شیخ معروف صدر سرکار بھکر، یہ نسخہ بیحد کمیاب اور نادر الوجود ہے، اسے شیخ فرید بھکری نے عہد شاہجہانی میں ترتیب دیا، اور نواب شائستہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا، ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، پروفیسر عبد اللہ چغتائی نے پچھلے سال رسالہ اسلامک کلچر میں اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا تھا، جو مولوی عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے پاس ہے، نیز اسی ضمن میں یہ بھی لکھا تھا، کہ نسخہ مذکور ناقص الآخر ہے، بفضل خدا حبیب گنج کا نسخہ مکمل ہے، خط شکستہ جلی شنجرفی آمیز، شروع میں امرائے عہد اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی کی مکمل فہرست ہے، کتاب کو تین باب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے میں امرائے اکبری، دوسرے میں جہانگیری اور تیسرے میں شاہجہانی، مورخین کرام مآثر الامرا کو امرائے مغلیہ کے حالات کا بہترین مآخذ قرار دیتے ہیں، مگر فرید بھکری اس مصنف مآثر سے بھی ایک صدی پیشتر گذر چکا ہے، اور عہد شاہجہانی کے حالات تو وہ عینی مشاہدے سے لکھتا ہے تذکرہ میں جابجا خود دیکھے ہوئے حالات اور اپنے اوپر گذرے ہوے واقعات بیان کرتا ہے، اس لحاظ سے تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ تذکرہ امرا مآثر الامرا سے بہت اہم ہے، ابو الفضل کے خاندان کی تاریخ لکھتے ہوئے تحریر کرتا ہے، کہ آج ابو الفضل یا اسکے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک فرد بھی موجود

نہیں، ان کی دلکشا منازل جو اکبرآباد میں تھیں سلسلہ عالیہ اعتماد الدولہ کے قبضہ میں آگئی ہیں، ع

بقا بقاے خدا یست و ملک ملک خدا،

ابوالفضل فیضی اور صدر الصدور کے باہمی مناظروں میں دو دلچسپ حکایات ایسی لکھی ہیں، جو دوسری کسی تاریخ میں نہیں ملتیں، اگرچہ مصنف مآثر شاہ نواز خان نے فرید بھکری کی طرز تحریر کو غیر مورخانہ بتایا ہے، مگر دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ صاحب مآثر نے کس قدر حالات حرف بحرف فرید بھکری سے لئے ہیں، کاش کہ جو محنت اور کوشش مآثر کے چھپوانے اور ترجمہ کرنے میں صرف کی گئی ہے، اس کا عشر عشیر بھی اس کتاب پر کی جاتی، تو تاریخ ہند کی اچھی خدمت سرانجام دی جاسکتی تھی، اس نسخے کی کتابت سنہ ۱۲۵۹ھ کی اور کاغذ نیم رنگ قدرے کرم خوردہ آب رسیدہ ہے،

۵- تذکرۃ الامرا کیول رام ولد رگھوناتھ داس قوم بانیہ اگروال متوطن قصبہ کاسہ صوبہ شاہجہان آباد کتاب کا تفصیلی نام احوال امرایان سلمین و راجہائے نامی از ابتدائے جلوس حضرت اکبر شاہ و جہانگیر و شاہجہان و عالمگیر ہے، مسلمان امرا کا باب بعد ان ہنود وامرا، کا جن کو خطاب راگی عطا ہوا اسکے بعد ان ہنود و اعیان کا جنکو کوئی خطاب نہیں ملا، ہر باب ترتیب حروف تہجی ہے،

اپنے متعلق مصنف لکھتا ہے، کہ میرے آبا و اجداد نے بادشاہان ہندوستان اور اس خاندان خلافت نشان کے امرا کی نمک خواری سے نشو ونما پائی، اپنے ماخذوں میں اکبر نامہ، اقبال نامہ، توزک جہانگیری، بادشاہ نامہ، عمل صالح، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری وغیرہ گناتا ہے، نیز لکھتا ہے کہ اس میں بعض ایسے خوانین کا حال درج ہے، جو کم مرتبت تھے، اور اس لئے اُن کا ذکر مآثر عالمگیری میں نہیں آیا، اپنی علمی کاوش کے متعلق لکھتا ہے کہ ہر ایک امیر کی قوم نسبت وطن منصب خطاب، خدمت اور سال وفات کی تحقیقات کے لئے ہر قسم کی کوشش کی گئی ہے، سنہ تالیف سنہ ۱۱۸۴ھ اور کتابت سنہ ۱۷ جلوس شاہ عالم غازی، مطابق سنہ ۱۱۹۰ھ کی ہے، یعنی تصنیف سے چھ سال بعد، الیٹ نے اس کتاب کا سنہ تصنیف سنہ ۱۱۹۴ھ لکھا ہے، جو غلط ہے، درحقیقت

یہ سنہ مآثر الامرا مصنفہ شاہ نواز خان کی نظر ثانی کا ہے، اس کتاب کے نسخے عجائب خانہ لندن اور انڈیا آفس میں بھی موجود ہیں،

۶- **احوال جنگ پانی پت**، مابین احمد شاہ درانی و بھاؤ مرہٹہ مؤلفہ متصدی نواب شجاع الدولہ وزیر اودھ یہ نسخہ خط شکستہ شنجرفی آمیز میں لکھا گیا ہے، کاتب سید محمد حسین حیدری مقام دیگ ہمراہ اردوے معلی در سنہ ۱۱۹۵ھ تمام شد،

اس کا مصنف کاسی راجہ پنڈت تھا، جو میدان جنگ میں شجاع الدولہ کی طرف سے احمد شاہ درانی اور بھاؤ کے پاس سلام و پیام پہنچاتا تھا، کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ لڑائی کے دوسرے روز بھاؤ کی نعش ملنے کے وقت وہ شجاع الدولہ کے ہمراہ تھا، اور حسب الحکم شجاع الدولہ اس نے بھاؤ کی لاش کو صندل اور گنگا جل سے غسل دے کر ہندوؤں کی رسم کے مطابق جلایا، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لفٹنٹ کرنل جیمز براؤن نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سنہ ۱۷۹۱ء میں شائع کیا، اور سنہ ۱۹۲۶ء میں اسکو دوبارہ پروفیسر راولنسن نے مع دیباچہ، حواشی، اور ضمیموں کے علمی دنیا سے روشناس کرایا، دیباچے میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں، کہ اصل نسخہ فارسی تباہ و برباد ہوگیا، علمی دنیا کو مولوی صاحب موصوف کی علم دوستی کا ممنون ہونا چاہئے، کہ ایسی نادر روزگار تاریخ غارتگری زمانہ کے ہاتھوں سے بچالی گئی، اصل فارسی اور انگریزی ترجمہ کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مترجم سے کہیں کہیں فروگذاشت ہوگئی ہے، فارسی نسخہ میں ایک نقشہ جو شاہ ابدالی کے لشکر گاہ کا دیا ہوا ہے، وہ انگریزی نسخے میں موجود نہیں ہے، فارسی نسخہ کے اخیر میں مصنف لکھتا ہے کہ میں نے یہ تاریخ جنگ پانی پت سے انیس سال بعد لکھی ہے، مگر انگریزی ترجمے میں یہ درج ہے کہ یہ حالات ان واقعات کے مدت مدید کے بعد تحریر میں لائے گئے، سالوں کی تخصیص نہیں کی گئی،

یہ نسخہ جنگ پانی پت کی بیحد دلچسپ محققانہ اور عینی مشاہدہ پر مبنی تاریخ ہے، مصنف خود مرہٹہ برہمن تھا، لیکن دل سے شجاع الدولہ کا طرفدار تھا، جانبین کے حالات بے تعصبانہ اور غیر جانبدارانہ طریقے پر لکھے ہیں، بھاؤ کے قتل کے حالات کے لئے تو شاید اس سے زیادہ مستند کوئی اور شہادت نہ ہوگی، ابراہیم خاں افسر توپخانہ

نے جس دلسوزی سے حق نمک خواری ادا کیا، اسکو موثر الفاظ میں بیان کیا ہے، مولینا حبیب الرحمن خانصاحب کو خود بھی جنگ پانی پت کی متعدد روایات یاد ہیں، امید ہے کہ اگر ان کو کبھی موقع ملا، تو اپنے اس بیش بہا ذخیرہ سے جو انھون نے تاریخی حکایات کا فراہم کر رکھا ہے، علمی دنیا کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع دینگے،

۹۔ تغلق نامہ امیر خسرو، یہ کتاب جو فہرست میں جہانگیر نامہ ملا حیاتی کاشی کے نام سے درج ہے تحقیقات جدیدہ کی رو سے تغلق نامہ کا وہ ناقص نسخہ ہے، جو شہنشاہ جہانگیر کے پاس موجود تھا، اگر یہ نظریہ صحیح ہے، تو یہ نسخہ اس قیمتی تالیف کا یکتا نسخہ ہے، کچھ عرصہ ہوا سید ہاشمی صاحب نے تغلق نامہ کو طبع کرا دیا ہی، چونکہ یہ نسخہ مختلف مشاہیر علم کی طرف سے علمی دنیا کے سامنے کئی بار پیش کیا جا چکا ہے، اس لحاظ سے اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے،

مذکورۂ بالا نسخوں کے علاوہ فن تاریخ میں اور بہت سی مفید کتابیں ہیں، ایک تزک بابری جو آگرہ کالج کے مشہور و معروف شاہی نسخے کی نقل ہے، اس کے علاوہ فارسی ترجمہ تاریخ یمینی اور تاریخ نگارستان احمد بن عبد الغفار قزوینی کے اچھے نسخے کتب خانے میں موجود ہیں،

اعلان

۱۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر ماہ کی آخری تاریخوں تک دفتر میں آجانی چاہئے، تاکہ پرچہ دوبارہ بھیجدیا جائے، دیر میں اطلاع موصول ہونے پر پرچہ بقیمت بھیجا جائے گا،

۲۔ معارف سے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت اور ارسال زر میں براہ کرم نمبر خریداری (چٹ نمبر ۱) کا حوالہ ضرور دیجئے، ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی،

"منیجر"

ہندوستان کے دو قدیم گمنام شاعر

میر مسیحی سبزواری؟

اور

میر سید علی سالک سبزواری؟

از جناب محمد عبد الوہاب صاحب مسلم بی اے، حیدر آباد دکن،

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے کی اسلامی و ادبی و علمی تاریخ بحیثیت تاریکی میں ہے، ابھی دو سال ہوئے کہ مطہر کڑہ کا نام معلوم ہوا ہے، اب ہمارے دوست مولوی عبد الوہاب صاحب مسلم کو میر مسیحی سبزواری اور میر سید علی سالک سبزواری دو شاعروں کے فارسی دیوان ہاتھ آئے ہیں، لیکن ان کا حال نہیں ملتا، اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب نظر ان پر روشنی ڈالیں تو علم کی خدمت ہوگی،

مسلم صاحب کا خط حسب ذیل ہے:۔

"س"

مخدومی و معظمی، السلام علیکم

میں نے عرصہ ہوا آپکو سالک اور مسیحی سبزواری کے دو نایاب دیوانوں کے متعلق توجہ دلائی تھی، اور آپنے اپنے گرامی نامہ میں ان کے نام اور تفصیلات پوچھی تھیں، علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث کچھ نہ لکھ سکا، تذکرے کئی دیکھے، لیکن کہیں پتہ نہ چلا، کہ یہ کون ہیں، اور فدن شاہ بادشاہ جسکی مدح میں مسیحی سبزواری نے قصیدے لکھے ہیں، کون تھا، بہر حال حسب ارشاد ان دونوں کے نام فی الحال بھیجتا ہوں،

۱- میر مسیحی سبزواری، ۲- میر سید علی سالک سبزواری،

میر مسیحی | میر مسیحی نے سلطان علاء الدین فدن شاہ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اور سید علی سالک نے سلطان سکندر کی شان میں، دونوں دیوانوں میں قصائد کے بعد غزلیں ہیں، مسیحی اکثر جگہ سلمان ساؤجی انوری اور ظہیر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے، مثلاً

این مطلع ار صبا ببرد جانب عراق، ... بلبیک زہ ز تربت سلمان بر آورد،

اس کے علاوہ بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے، کہ فدن شاہ ہندوستان کا بادشاہ تھا، اور شاعر ہندوستان آیا تھا، بادشاہ جاہل بھی نہ تھا، (اگر ہم علاء الدین خلجی کو تصور کریں)

بعد از ہزار سال کہ دوران سفر گشد، ... چو من یکے کجا ز خراسان بر آورد،

در ہند اگرچہ ہست سخنگوے بے قیاس، ... کاقبال شاں گرفتہ بدیوان بر آورد،

یارب چہ کم شود چو منے گر ز مجلست، ... سرخ و سپید تنگہ بداماں بر آورد،

من خوش شدم کہ شاہ نصیحت وظاہر است، ... کیں نکتہا بطبع سخنداں بر آورد،

اسیر کردۂ خوبان ہند شد دل من ... صبا حدیث مسیحی بہ سبزوار رساں،

اکثر اشعار میں فدن سلطان اور علاء الدین کے نام اور عرف آئے ہیں، مثلاً

سپہر لطف و جہان کرم فدن سلطان ... کہ بر یمین و یسارش روند فتح و ظفر،

شہ ستارہ حشم بادشاہ علاء الدین، ... مدار مرکز دانش جہان امن و اماں

ایک سفر کے متعلق لکھا ہے،

یعنی کہ رسید از سفر آں شاہ کہ تیغش، ... ہر لحظہ بر آورد دمار از سر کفار

ایک اور شعر ملاحظہ ہو،

نیکشد در ہوس زلف و رخت خاطر ما ... بہ سواد ختن و مملکت بنگالہ،

میر سید علی سالک | دوسرا شاعر میر سید علی سالک سبزواری ہے، جو سلطان سکندر ثانی کی مدح کرتا ہے، گویہ سلطان سکندر ثانی علاء الدین تغلق نہیں، بلکہ سلطان سکندر لودی ابن بہلول لودی ہے، داخلی شہادت ملاحظہ ہو،

شمار بود ز تاریخ نہ صد و یک سال ... کہ فتح و نصرت سلطان کامگار آمد،

بتاریخ بد نہ صد و چار و دہ، ... کہ شد فتح نگور با اقبال شہ

آخری شعر ایک جنگ نامہ (مثنوی) سے لیا گیا ہے، جس میں اجی راج راجہ نگور کی شکست کا حال ہے،

نگور چو دارائے دوراں رسید، ... اجی راج ہم مرگ خود را بدید

سالک کے چند شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اوس کا چچا پہلے سبزوار سے ہندوستان آیا تھا، اور بادشاہ نے اسکو جاگیر دی تھی، اسکے بعد سالک آیا، اور اس نعمت سے سرفراز ہوا، سالک کہتا ہے،

سالک، چو عم من از گردش روزگار ... بہند آمد از خطۂ سبزوار،

شہنشاہ دہلی مبارک بنام ... بسادات محمود کرد احترام،

چو بادشاہ آن میر کرد اختیار ... شد و چار چہ ملک آن بختیار،

چہل سال افتاد آن قریہ طرح ... حکایات آنرا نگفتم بشرح

بہلول، شہنشاہ ہم کرد اعطا مرا، ... برسم پدر داد طغرا مرا

تہا چار چہ ملک فیبوع نیست ... اگر ملک گویند شرع نیست

دونوں دیوان ایک ہی کاتب نے لکھے ہیں، اور ۹۴۳ھ درج ہے،

میں نے چند نوٹس اس سے قبل لئے تھے، لیکن وہ اسوقت خدا جانے کہاں غائب ہو گئے، اسلئے سرسری مطالعہ کے بعد آپکی خدمت میں یہ چند اشعار ارسال ہیں، میرا خیال ہے کہ میر مسیحی، سالک کا پیشرو اور سلطان علاء الدین بن محمد شاہ بن مبارک شاہ بن خضر خان کا متوسل تھا جو ۸۴۹ھ سے ۸۵۵ھ تک حکمراں رہا، اسی طرح سالک سلطان سکندر لودی کا متوسل تھا، جسکی حکومت ۸۹۴ھ سے ۹۲۳ھ تک ہی، داخلی شہادت سے ان دونوں شاعروں کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں لیکن خارجی شہادت کوئی نظر سے نہیں گذری، اگر آپ مدد فرمائیں تو بہت ممنون ہونگا،

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانح خودنوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۶)

شعر و سخن، اگرچہ میں نہ کوئی اصطلاحی شاعر ہوں، اور نہ سخن طرازی اور سخن سنجی کا مجھکو دعوی ہے، لیکن بدو فطرت سے طبع موزوں ضرور ساتھ لایا ہوں، اور ابتدائے تعلیم سے ذوق شعر و سخن کی چاشنی کا لذت آشنا ہوں اسلئے برسوں کوچۂ شعر و سخن کی خاک اُڑانا پڑی، اور جلوت و خلوت میں شب و روز اسی سوز و ساز اور ہجوم ناز و عرض میں زندگی کے دن کاٹنا پڑے، اسی عالم جوش و خروش اور شغلۂ شعر و سخن میں غزلیات و اشعار فارسی و اردو کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب ہو گیا تھا، جو شاید دو کلیات ضخیم کے برابر ہوتا، مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب دل ان رنگ رلیوں سے پھیکا پڑا، تو وہ مجموعۂ غزلیات و اشعار بھی تاراج دست تغافل اور نذر آتش کر دیا گیا، ع

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

خدا جانے کس طرح ابتدائی عمر کے معدودے چند اشعار اور غزلیں فارسی اور اردو کی بعض اوراق میں لکھی ہوئی پڑی رہ گئی تھیں ان کو بعض اعزہ نے ترتیب دے کر فارسی غزلیات و اشعار کا مجموعہ بنام خرمن گل، اور غزلیات و اشعار اردو کا مجموعہ بنام نالۂ دل طبع کرا کے شائع کرا دیا، سچ یہ ہے کہ فارسی اور اردو کلام دونوں محتاج نقد و

نظر و انتخاب تھے، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو ان پر نظر ثانی کرنیکی نوبت نہیں آئی انکی اشاعت کے بعد جو کلام جمع ہوا وہ حسب ذیل ہے،

فارسی کلام،

بشگفتہ از تجلی تو لالہ زار ما، ۔۔۔ نور یقیں ستارۂ صبح بہار ما

ما را ز نور مصطفوی سینہ روشن است ۔۔۔ ایں بس چراغ راہ بہ شبہائے تار ما

الٰہی عشوہ ہائے دلربائی دہ بیانم را، ۔۔۔ حریف نرگس جادو نگاہاں کن زبانم را

زعشق مصطفےٰ آن بلبل گلزار توحیدم ۔۔۔ خس و خار است از بال ملائک آشیانم را

لب خاموش ما را زنگ تاثیرے کرامت کن ۔۔۔ ز اشک سرمہ آلود بتان ترکن زبانم را

چو گل در باغ ہستی فرصت یک خندہ می باشد ۔۔۔ نسیم صبح می گوید کہ بر بندید محملہا

رسیدن کے توانم منتہائے حسن را یاز ۔۔۔ کہ در ہر جلوہ اش باید نمودن قطع منزلہا

در شیوۂ تسلیم چہ دخل است ریا را، ۔۔۔ از گرد ہوس پاک کنم روئے نگارا

گفتم بہ چمن تا صفت آن کف پارا ۔۔۔ گلبرگ بہ حسرت نگرد برگ حنارا

بر چہرہ پریشان مکن این زلف دوتارا ۔۔۔ زنجیر مجنبان دل دیوانۂ مارا

تا دل نہ کشاید نہ دہد جلوہ معانی، ۔۔۔ بے بادۂ صافی نتواں جُست صفارا

روشن ز نور عالم فطرت بیان ما، ۔۔۔ یک اسم اعظم است زبان در دہان ما

رسوائے درد عشق کسے این چنیں مباد ۔۔۔ باید شنید از لب دشمن فغان ما

بے صرف عمر وصل میسر نمی شود، ۔۔۔ ذوق فناست زندگی جاودان ما

طاہر زمان ماضی ما خوش زحال تو ۔۔۔ اے کاش رد کند بقفا کاروان ما

ہزار جلوۂ در آغوش کردۂ مارا ۔۔۔ شہید ناز مدِ گل پوش کردۂ مارا،

نیست عرق کہ دیدۂ بر تن پر گزند ما ۔۔۔ چشم تر یم و می چکد اشک ز بند بند ما

ہر ستمے کہ میکنی بر دل درد مند ما ۔۔۔ عذر ستم گمان کند طبع وفا پسند ما

آبادیِ حق است بہ ویرانیِ دلہا — جمعیتِ دلہاست پریشانیِ دلہا

لبریزِ دل از کینہ زبان پُر ز نیایش — ہمسایۂ کفر است مسلمانیِ دلہا

مرقدِ ابرار شد بت خانۂ اسلامِ ما — کفر می خندد بہ توحیدِ دلِ ناکامِ ما

بے خلش مقصدِ دل جلوۂ ذوقے ندہد — سنگ در رہ فگن خار بدیوار طلب

جمع ضدین محال است جہانے داند — طالبِ حق نبود مردمِ دینار طلب

دیدۂ روزنِ دیوار چہ بیند زاہد — چشم بیدار چہ جوئی دلِ بیدار طلب

ز حسنش چشم حیران است امشب — چہ حیرتہا کہ عرفان است امشب

ز داغِ دل بہاران است امشب — در آغوشم گلستان است امشب

چہ بر جانم گذشت از دردِ ہجران — کہ جانم آفتِ جان است امشب

دمِ وداعِ تو تمکینِ عشق را نازم — کہ اشک بر مژہ مائلِ چکیدن نیست

کو وعدۂ تو وعدۂ فردا شدنی نیست — ایں عقدۂ لاینحل ما واشدنی نیست

صد پارہ دلم جامعِ مضمونِ وفا بود — افسوس کہ ایں نسخہ بیکجا شدنی نیست

خوشم بسایۂ اقبالِ بیکسی طاہر — نہ بندۂ کس و بے کس مرا خداوند است

در جلوہ طرازی نگران گلبدنے ہست — بشگفتہ در آئینہ بہر سو چمنے ہست

شوخی و حیا را بہم آمیختہ افسوں — این چشمِ تو مجموعۂ صد علم و فنے ہست

نگاہِ شوق بود ترجمانِ حالتِ دل — سوال از لبِ عاشق کمالِ بے ادبی است

بجا ز یار و ز من شکوہ جز تغافل نیست — میانِ عاشق و معشوق نسبتِ وہبی است

نہفتہ فتنہ دران چشمِ فتنہ زا خفت است — دلِ ستم زدہ داند بلا کجا خفت است

ز بختِ خفتہ کہ سرگشتگی بطینتِ اوست — بہ حیرتم کہ چساں خفتہ و کجا خفت است

دلم بیادِ تو کم از مریضِ بیکس نیست — کہ در امیدِ طبیب و غمِ دوا خفت است

زبان بہ فتنہ و جنگ است و دل بعیش گرائے — غنیم بر در و شہ در حرم سرا خفت است

دلم بہ قسمتِ مرحومہ سخت می لرزد — کہ رہزناں بہ کمین اند و رہنما خفت است

اشکے نہاں بگوشۂ چشمِ سیاہ کیست — شوخی ز شرم عقدۂ تارِ نگاہ کیست

گہ می کشد بہ عشوہ و گہ زندہ می کند — اعجاز آفریدۂ طرزِ نگاہ کیست

دامن کشیدنِ تو سرِ گناہِ من — خندیدن و نگاہ نکردن گناہ کیست

آن قوم کہ عشقِ تو نویدِ ظفر اوست — فتحِ دو جہان یک ہوسِ مختصر اوست

آنکس کہ جمالِ تو بہشتِ نظرِ اوست — دل نیست مگر حورِ بہشتی ببر اوست

بے روشنیِ دل نہ کشاید درِ عرفان — ہر چشم و دلِ آگاہ نشینِ رہگذرِ اوست

این شعبدۂ طرفہ دران گردشِ چشم است — ہر دل بہ نشاط است کہ سویم نظرِ اوست

از طعنۂ واعظ ز طلب باز نگردم — زین گونہ بسے فتنہ بہر رہگذرِ اوست

ز تیرِ نیم کشِ ناز بسمل افتاد است — ہزار حسرتِ دیگر دل چہ مشکل افتاد است

دلم بہ نرگسِ مستِ تو مائل افتاد است — ہزار میکدہ در گوشۂ دل افتاد است

نمک فروشی بہ صبحِ چمن تبسم کیست — کہ خندہ بر لبِ گل نیم بسمل افتاد است

گداختند و صد شعلہ قطرۂ بچکید — کہ نامِ آن لبِ عاشقاں دل افتاد است

زمانہ ایست کہ از بخت و چرخ نالہ کند — مگر ز کجروی خویش غافل افتاد است

نہ بیکنی بہ غلط ہم نگہ سوے طاہر — بگو چہ شد چہ شنیدی چہ در دل افتاد است

در غمِ عشقِ او دلم از غمِ ماسوا گذشت — گشت دوائے دردِ دل درد کہ از دوا گذشت

دلق رہینِ میکدہ سر بسبو و پائے خم — از لبِ جام بادہ پرس آنچہ بہ پارسا گذشت

من بہ کمالِ عشقِ خویش چون نہ زعقل بگذرم   گر بکمالِ عشقِ خویش فلسفی از خدا گذشت
رفت شباب و ماہنوز مست مئے شبانہ ایم   بخت بہ راہ خفتہ ماند قافلہ بے در گذشت

رمیدہ دل ز تو ابروے یار نزدیک است   کمان کشیدہ بیا کہ این شکار نزدیک است
حیاتِ عاشقِ دل خستہ گر وفا بکند   وصالِ یار بعد انتظار نزدیک است
بدیر و کعبہ مرو راہِ گوشۂ دل گیر   مقامِ دوست ازیں رہ گذار نزدیک است
قرارِ عیش بہ فردا منہ چو وقت رسد   بہوش باش غمِ روزگار نزدیک است
ندیمِ دوست اگر غیر شد چہ غم طاہر   مرنج گردشِ لیل و نہار نزدیک است

بہر صرفِ عمرِ عاشق یک رخِ زیبا بس است   گر بود مقصود قدرِ حسن یک شیدا بس است
حکمت و نفعِ مے و میخانہ از ساقی بپرس   پیشِ مستان ناؤ نوش و شور و غوغا بس است

روز و شب سرگرم کارِ خود دلِ دیوانہ ایست   عشق از عقل است خالی این ہمہ افسانہ ایست
فلسفی عارف نہ گردد از طریقِ بحث و عقل   در رہِ پر پیچ عشقش عقل ہم دیوانہ ایست

عشقش پئے شکستِ دلِ خود پرستِ ماست   پنہان ہزار فتح دریں یک شکستِ ماست
معشوق و شعر و طاعتِ حق برگزیدہ ایم   این انتخاب طبعِ حقیقت پرستِ ماست

بہارِ عالمِ ہستی ز قامتِ یار است   نہالِ خوش ثمرے آبروے گلزار است
فقیہ در طلبِ جاہ و محتسب مے نوش   دریں زمان یکے اعتماد بے کار است
نہ ہر مزاج بہ یک شیوۂ و نہ ہر معشوق   ہزار رنگ بہ یک شغلِ عشق درکار است

ز مژدہائے وصالِ تو خوش شدم لیکن   بوعدۂ تو و بختِ خود اعتبارم نیست
کسے نہ کرد چو من جمع عشق و حکمت را   ہزار حیف کہ مجنوں بروزگارم نیست

غیر یک شاہد دگر منظور نیست   شرک اندر عاشقی مغفور نیست

سجدۂ پیشِ بتاں در شرعِ عشق   واجبِ عینی است آن محذور نیست
اندکے صبر و تحمل بایدت   یار خود آید بسویت دور نیست
صوفیِ ما کافر و مومن نماست   ہر انا الحق گوئی ہم منصور نیست

بہشتِ عشق وصال است و ہجر دوزخِ او   میانِ ہجر و وصالش مقامِ اعراف است
ز بد مذاقیِ زہاد عقدہا افتاد   وگرنہ مسئلۂ عشق از ہمہ صاف است

فطرت اللہ اگر جلوۂ ایمانی نیست   کفر را ہیچ تفاوت ز مسلمانی نیست
رخنہ ہائے عجبے در رہِ ملت افتاد   کہ مسلمان ہمہ جمع اند و مسلمانی نیست

باید عمل بحکمِ مغان در سلوکِ عشق   موقوفِ کارِ دہر بحکم و ہدایتے است
ذکرِ پری و تذکرۂ حور پیشِ تو   افسانۂ مخالفِ عقل و درایتے است
عاشق کہ زندہ ماند شبِ ہجر کشتنی است   بیدادِ دوست در حقِ او ہم عنایتے است

حسنت بہ ناز و عشوہ دلِ یک جہاں گرفت   آورد حسنِ یوسف و حسن از جہاں گرفت
چوں دید چشمِ مستِ تو زاہد دمِ نماز   سجادہ برفگند و مے ارغواں گرفت
تا بوئے گل گراں نشود بر مشامِ تو   ہر گل ز برگ پیشِ تو کف بر دہاں گرفت

ہر چہ خواہی ہست جز چیزے کہ در کار است و نیست   دوستی چیزے است در عالم کہ بسیار است و نیست
گہ برد شوقم بسویش گہ کشد وہمم بہ پس   طرفہ چشمِ نیم بازِ او کہ بیدار است و نیست
چشمِ ظاہر بیں کجا کو دیدۂ فطرت شناس   نیست یک چیزے دریں عالم کہ اسرار است و نیست
از علائق رستہ و وابستۂ زلفِ نگار   طاہرِ وحشت سرشتِ ما گرفتار است و نیست

دارند شیخ و رند بوصفت بیاں صریح   لیکن کسے نمی دہد از تو نشاں صریح
دزدید دل خرامِ تو انیسم گماں نبود   میداشتم بہ دزد خیانت گماں صریح

جز من کسے نگشت خریدارِ جنسِ عشق
دارد ز بس کہ نفع نہان و زیان صریح

گو ز جلوۂ جوشِ بہاری می خیزد
جنون ز گردش دامانِ یار می خیزد

خدنگش بہ نازے کہ در دل نشیند
نہ زنہار لیلی بہ محمل نشیند

خواستم سخت در آغوش کشم در شبِ وصل
مگر افسوس کہ یار است چہ می باید کرد

جنون اے دل بانداز نگاہ یار می باید
برائے شور و مستی ہم دلِ ہشیار می باید

شدن با گلرخان ہم بزم و از قید خرد رستن
نمی باید ولے در فصلِ گل یک بار می باید

ندارم امتیاز بوسہ و دشنام سرمستم
نمی خواہم کہ ہاں می باید و بسیار می باید

نگارِ من بہ یک نیم نگہ صد لشکر اندازد
ز ابرو ہر کجا شوخے است پیشش خنجر اندازد

ز نوایکاد ہا ہر شب لطافت آفرین طبعش
در آداب وصال و بوسہ طرحِ دیگر اندازد

گر آید در سلوکِ عشق عاقل ادیس شرط است
ہر آن چیزے کہ دارد در سر خود از سر اندازد

زہے رندے کہ از ہشیاری مستی نما طاہر
بگیرد دامنِ ساقی و از کف ساغر اندازد

عاشق نبود کافر و دیندار نہ باشد
در مذہب او سبحہ و زنار نباشد

پابند علائق نبود خاطرِ آزاد
این مرغ بصد دام گرفتار نباشد

صد نالہ و صد گریہ و صد جذبہ بباید
رہ در دل معشوق بہ یکبار نباشد

آنکس کہ چو طاہر نبود بندۂ عشقش
زنہار کہ از فرقۂ احرار نباشد

ہر چند گوشہ گیر چو عنقا شدم ز دہر
اما اسیر کشمکش تہمتم ہنوز

طاہر کسے ز اہلِ وطن یاد ما نکرد
شرمندۂ وطن نبود غربتم ہنوز

چو بادِ صبح گہ بر برگِ گل گہ بر خار افتم
جنون مست بہارم تا کجا خیزم کجا افتم

خواہم کہ رسم کہنۂ گیتی بر افگنم
ق
در مشرب جنون روشِ دیگر افگنم

ہم عشق را بہ صیقل دانش دہم فروغ
ہم عقل را بہ پائے جنون سر در افگنم

در دین ز وعظ بیخرداں رخنہا فتاد
رازِ درونِ شرع سر منبر افگنم

زاہد بہ جستجوے در و من ز قربِ عشق
در خلد زیر سایۂ گل بستر افگنم

ترا با نام حقؒ کار است زاہد کارِ من با حق
تو از اسلام می گوئی و من اسلام می خواہم

از ادائے کم نگاہی مدعا فہمیدہ ام
اشتعال انگیزی طرزِ حیا فہمیدہ ام

حسن ہم عشق است لیکن رنگ نامِ دیگر گشت
بعد مدت معنی ناز و ادا فہمیدہ ام

برہمن دارد بتے زاہد بدل صد بت نہان
ساده لوحی بین کہ او را باخدا فہمیدہ ام

با غنائے نفس نسبت نیست مال و جاہ را
فقر را من سایۂ بال ہما فہمیدہ ام

در اول قدم سر و سامان گذاشتیم
صد شکر کارِ عشق بہ پایان گذاشتیم

غیرت نداشت تاب فریبِ متاعِ جاہ
جاگیر را بقبضۂ سلطان گذاشتیم

انصاف از عدالتِ گیتی طمع مدار
ما کارِ خود بہ صاحبِ دیوان گذاشتیم

طاہر ز بحثِ عقل پریشان نیم فزود
تحقیق این مقالہ بہ نسیان گذاشتیم

در حضور و غیب دشوار است یکسان زیستن
با تو تواں بودن و ہم بے تو نتوان زیستن

شادی و غم در جہان جز اعتبارے بیش نیست
ہمچو گل باید بہ ہر یک فصل خندان زیستن

جامۂ زہد ریائی چاک زن طاہر خوش است
عارفِ حق بودن و بر وضع رندان زیستن

خود را نہ پرستیدہ عرفاں چہ شناسی
کافر نشدی لذتِ ایماں چہ شناسی

بیرون نہ نہادی قدمے از درِ خانہ
آویزشِ خار سرِ داماں چہ شناسی

یک جرعہ ز سرچشمۂ فطرت نہ چشیدی
گوہر شدنِ قطرۂ نیساں چہ شناسی

؎ نامِ حق نام کتابے ست در فقہ۔

کلام اردو

کامل ہے اور اکمل سارا انتظام تیرا، فطرت ہے کام تیرا مصحف کلام تیرا،
اعلیٰ ہے ذات تیری ارفع صفات تیرے فانی ہے سارا عالم باقی ہے نام تیرا،

عارف سے رہے کیونکر انداز چھپا تیرا آئینہ فطرت ہے خود جلوہ نما تیرا،
پھولوں میں مہک تیری کانٹوں میں کھٹک تیری سب تجھ سے ہیں اور سب سے ہے جلوہ جدا تیرا
ہفتاد و دو ملت ہیں آشفتہ و سرگردان گم گشتہ دلوں میں کچھ لگتا ہے پتا تیرا،
جس دل نے تجھے پایا سب کچھ ہی تو بھر پایا کونین سے مستغنی رہتا ہے گدا تیرا
بتخانہ میں ہندو بھی پڑھتا ہے کتھا تیری مسجد میں اگر مومن ہے حمد سرا تیرا،
اک راز حقیقت ہے دنیا کی مصیبت بھی تسکین دلوں کی تو اور لب پہ گلا تیرا،

طاہر کی دعا یہ ہے ہنگام اجل لب پر
بے ساختہ نام آئے اے یار خدا تیرا

بکی قیمت نہ اپنے جنس دل کی ان حسینوں میں کسی نے کچھ کہا اسکو کسی نے اور کچھ آنکا
یہ دشت عشق اور یہ حضرت دل دیکھئے کیا ہو کہ منزل ہے کڑی اور پڑ گیا ہے ساتھ نادانکا

تلاش دل نے شرمندہ کیا کیا اہل محفل سے
یہاں ڈھونڈھا وہاں ڈھونڈا ادھر تاکا ادھر جھانکا

عشق میں احساس خودداری بہت دشوار تھا آپ کے جور و تشدد سے وہ آسان ہوگیا

پایا تھا عشق نے دل مرحوم سے فروغ افسوس کیا چراغ محبت کا گل ہوا
تم نے کئے جو ظلم کسی نے خبر نہ لی، میں نے کیا جو نالہ تو اک شور و غل ہوا

اس شوخ سے بے سمجھے یوں دل کا لگانا تھا چالوں پہ نظر رکھتے باتوں میں نہ آنا تھا
ہیں آج وہ بیگانہ کل تک میرے طالب تھے اک یہ بھی زمانہ ہے اک وہ بھی زمانہ تھا

آئینہ دیکھ کے دل تھام لیا کرتے ہیں سیکھتے جاتے ہیں اب وہ بھی لگانا دل کا،

عشق کی گرمی محفل دل مرحوم سے تھی آپ کی جان سے دور آج بہت یاد آیا،

خدا سمجھے دل بے خانماں کو کسی کا راہبر رہزن کسی کا
تجھے اے سوزش الفت لگی آگ جبیں ہم نام ہو روشن کسی کا
خرام ناز بھی کیا جانستاں ہے کہ ہے ہر نقش پا مدفن کسی کا

اس سے کیا بحث کہ ہے جلوہ کسی کا کیسا دیکھنا یہ ہے کہ ہے دیکھنے والا کیسا،
سیر منظور ہے تو آئینہ لے کر دیکھو تم تماشائے دو عالم ہو تماشا کیسا،

جب نامۂ دلدار کو دیکھا اوسے دیکھا تحریر دل آزار کو دیکھا اوسے دیکھا
عشاق میں آجاتے ہیں معشوق کے اوصاف بیتاب دل زار کو دیکھا اوسے دیکھا،

خیال رخ میں تار شمع ہر اک تار بستر تھا ترا جلوہ فروغ طالع بیدار بستر تھا
زہے بخت مریض غم عیادت کو وہ آئے تھے یہ سر رنجور بالش تھا یہ تن بیمار بستر تھا

میری یہ چشم شوق ہی خود بن گئی میری رقیب چھپکے چلمن سے کسی کا جھانکنا جاتا رہا،

نمک افشاں جو ذرا خندۂ قاتل ہوتا، بوسۂ تیغ لب زخم پہ بسمل ہوتا،
جمع کرتا میری ویرانی کے ساماں جو فلک ایک منجملۂ اسباب میرا دل ہوتا،
تیری رفتار نہ کرتی جو قیامت برپا دل وہ کافر ہے قیامت کا نہ قائل ہوتا
بے غرض پا کے وہ کرنے لگے خاطر طاہر آرزو سے یہ کہاں مرتبہ حاصل ہوتا

جی بھر کے مزا دید کا حاصل نہیں ہوتا افسوس کہ آنکھوں میں کوئی دل نہیں ہوتا
یہ معجزۂ حسن ہے یا زندہ کرامت محبوب جہاں میں کوئی قاتل نہیں ہوتا

محشر دم رفتار ترے در سے اٹھیگا جو فتنہ اٹھے گا وہ اسی گھر سے اٹھیگا

تارے نظر آجائیں گے خورشید کو دن میں
پردہ جو ذرا بھی رُخِ انور سے اٹھیگا

ــــــ ـ ـ ــــــ

ترکِ مۓ اور صحبتِ زہاد
پارسائی میں ہیں عذاب بہت

ــــــ ـ ـ ــــــ

کیا بھیڑ لگی ہے سرِ بازارِ محبت
ایک ایک پہ گرتا ہے خریدارِ محبت

مر کر بھی تو جاتا نہیں آزارِ محبت
مر مر کے جیا کرتے ہیں بیمارِ محبت

معلوم ہو گر لذتِ آزارِ محبت
خود بیچدے اپنے کو خریدارِ محبت

معشوق زباں سے تو کبھی ہاں نہیں کرتے
ہاں آنکھوں میں ہوجاتے ہیں اقرارِ محبت

ــــــ ـ ـ ــــــ

چلتا ہے بات بات پہ واں نسخۂ جفا
ہے ورنہ ہر مرض کا جہاں میں حد علاج

لازم ہے صبر عشق میں طاہر وہ ہی نہیں
پرہیز اس مرض میں ہے سب سے بڑا علاج

ــــــ ـ ـ ــــــ

مانگے جو دلِ فگار تعویذ
ہوں داغ جگر ہزار تعویذ

بازو میں جو موج قلزم حُسن
ہیں گوہر شاہوار تعویذ

بوٹا سا وہ قد ہے شاخ برگل
اور غنچۂ نوبہار تعویذ

ــــــ ـ ـ ــــــ

ہوا یہ حالِ دل فرقت کے صدمے اب تو سہہ کر
کھٹک ہوتی ہے تھم تھم کر کسک ہوتی ہے رہ رہ کر

کہوں کیا حالِ فرقت آنسوؤں کے بدلے نکلا ہے
کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لہو آنکھوں سے بہہ بہہ کر

ہم اس انداز سے بیتاب ہو کر وصل میں لپٹے
چھپا جاتا تھا خود بادل میں تب کو جا گہ گہہ کر

ــــــ ـ ـ ــــــ

ساقی کے جلوہ کی ہیں یہ سب عشوہ سازیاں
نغمہ ہے کوئی نے میں نہ مستی شراب میں

ہستی ہے میری دو عدموں کی گھڑی ہوئی
میں خود ہوں ایک خواب میانِ دو خواب میں

واعظ کے دل کو ذوقِ محبت سے مَس نہیں
گویا وہ ایک مردہ مگس ہے کتاب میں

ــــــ ـ ـ ــــــ

آہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
دم پہ بن جائیگی کہیں نہ کہیں

کھو نہ رو دے آتشیں نہ کہیں
آگ بھڑکیگی یہ کہیں نہ کہیں

ے ہی آئے گا جذبۂ الفت
ل ہی جاؤ گے تم کہیں نہ کہیں،

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا سوے ماہ
میلی ہو چاند سی جبیں نہ کہیں

ــــــ ـ ـ ــــــ

خوف ہو مانع تو پھر تم کیا کرو
دل نہ ہو بس میں تو پھر ہم کیا کریں

ــــــ ـ ـ ــــــ

تجھ میں ہے اے نگہ ہوشربا کیا کیا کچھ
غمزہ و شوخی و انداز و ادا کیا کیا کچھ،

عہد میں تیرے وفا پر ہے ہوس کو ترجیح
تھی کبھی قابلِ تعریف وفا کیا کیا کچھ،

غصہ و چشم نمائی و حیا لطف و کرم
کر گئے نیم نگہ میں وہ ادا کیا کیا کچھ،

بے ریائی سے ہوا اپنے میں رسوا زاہد
ورنہ حضرت نے بھی چھپ چھپکے کیا کیا کیا کچھ،

ــــــ ـ ـ ــــــ

چلتے پھرتے گالیاں بیداد اٹھتے بیٹھتے
اک نزاکت رہتی ہے واں ایجاد اٹھتے بیٹھتے،

معجزے قدرت کے ہیں یہ گلرخانِ دہر بھی
گل ہیں ہنستے بوتے شمشاد اٹھتے بیٹھتے

ــــــ ـ ـ ــــــ

ہجر میں باعثِ تسکیں تو ہو لے جاں کوئی
ظلم بھی ہو تو اسے مان لے احسان کوئی

نظر آتا نہیں دل بچنے کا ساماں کوئی
خالی جاتا ہی نہیں ناوکِ مژگاں کوئی

کر دیا روز کی شوخی نے حیا کو بے باک
رکھئے اب اپنے نگہباں کا نگہباں کوئی

ہیں جنوں میں بھی تو دلچسپی کے ساماں بہت
پا بزنجیر کوئی چاک گریباں کوئی

اے اجل ایک نظر دیکھ تو لینے دے مجھے
بال کھولے ہوئے آتا ہے پریشاں کوئی

ہے حسینوں ہی سے اس بزمِ جہاں کو رونق
گل گلزار کوئی شمعِ شبستاں کوئی

آپ طاہر سے جو واقف نہ ہوں میں بتلادوں
پچھلی راتوں کو نکلتا ہے غزلخواں کوئی

خزاں کی یاد دلاتی ہے یہ بہار مجھے
ہوائے عیش بھی ہے اب تو ناگوار مجھے

اگر یہی ہے تلوّن تو شامِ وصل میں بھی
رہے گی کشمکشِ یاس و انتظار مجھے

ہوئے ہیں ضعف سے اجزائے جسم سب تحلیل
ہر ایک ذرہ ہے اب محشرِ غبار مجھے،

فضائے باغ ہے سب تنگ دامن گلچیں،
خزاں سے کم نہیں یہ موسمِ بہار مجھے

جورِ بتاں کی کچھ تو مکافات چاہیئے
ان کافروں سے ترک موالات چاہیئے،

نیرنگیِ صفات ہے اک جلوۂ سراب
عاشق ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

مانا کہ شیخ آپ ہیں مستجمعِ صفات
للّٰہیت بھی قبلۂ حاجات چاہیئے

ہائے کیا چیز چاہ ہوتی ہے
ہر نگہ ایک آہ ہوتی ہے،

شوخیوں سے ہے اضطراب عیاں
دل کو خود دل سے راہ ہوتی ہے

مذہبِ عشق میں ہے ترک خودی
آرزو بھی گناہ ہوتی ہے،

پائمالِ نگاہِ ناز ہے دل
کیسی بستی تباہ ہوتی ہے

ہر قدم پر رہِ محبت میں
عقل ہی سنگِ راہ ہوتی ہے

جلوہ افروزیِ جہانِ وجود
اک فریبِ نگاہ ہوتی ہے

عشق میں بھی کبھی ہوس ہے مگر
سببِ اشتباہ ہوتی ہے

جس سے کھلتے ہیں رازہائے خفی
وہ تو صرف اک نگاہ ہوتی ہے

جلوۂ رخ سے یہ دل ایسا پریخانہ بنے
ہر جگہ رونقِ محفل میرا افسانہ بنے،

بزم افروز اگر جلوۂ جانانہ بنے،
شعلہ اڑ اڑ کے ہر اک شمع سے پروانہ بنے

اثر انداز اگر نرگسِ مستانہ بنے،
ایک گھر بھی نہ ہوا ایسا جو مے خانہ بنے،

وہی کامل ہے جو سالک بھی ہو مجذوب بھی ہو
کہیں فرزانہ بنے اور کہیں دیوانہ بنے،

دل پڑا اور قبضہ بتوں کا ہو خدا کی قدرت
اے تری شان کہ یوں کعبہ صنمخانہ بنے،

مے پرستی ہے ازل سے دلِ نازک کی سرشت
یہ وہ شیشہ ہے جو ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے،

تلخیص و تبصرہ

جسم انسانی کے اندر خارجی اشیاء کی نقل و حرکت

اس موضوع پر ڈاکٹر فریڈریک ڈیمرا (F. Damrau) کا ایک دلچسپ مضمون رسالہ پاپولر سائنس بابت مئی ۳۷ء میں شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انسانی جسم کے اندر انواع و اقسام کی خارجی چیزیں کس آسانی کیساتھ نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں، نیز جدید فن جراحی کی بھی داد دینی پڑتی ہے، جو ان اشیاء کو برآمد کرنے میں کمال دکھا رہا ہے، مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

چند سال ہوئے ایک مزدور کے انگوٹھے میں لکڑی کی ایک پھانس چبھ گئی، وہ جہاز کے ایک بڑے کارخانہ میں کام کرتا تھا، اور چونکہ اس قسم کے واقعات اُسے اکثر پیش آتے رہتے تھے اسلئے پھانس کو نکالنے کے لئے وہ اپنی واسکٹ کی جیب میں ایک چھوٹی سی سوئی رکھا کرتا تھا، چنانچہ اس مرتبہ بھی انگوٹھے سے پھانس کو نکالنے کے بعد اپنے سوئی جیب میں رکھ لی، وہ اسوقت جھکا ہوا تھا، اور اسے اپنے سینہ میں کوئی چیز تیزی کیساتھ چبھتی ہوئی محسوس ہوئی، اوس روز رات کو اس نے دیکھا کہ سوئی اسکی جیب سے غائب ہے، اور جلد پر ایک شوخ سُرخ دھبہ ہے، اکسرے سے معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سوئی سینہ کے عضلات کے اندر سے ہوتی ہوئی اس شخص کے قلب کی طرف جا رہی ہے، قبل اس کے کہ وہ نکالی جا سکے اسکی نوک قلب کے بائیں خانہ میں داخل ہو چکی تھی، ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے سوئی کو نکالنے کی کوشش کی، مگر وہ ہاتھ نہ آئی، آپریشن کے بعد مریض کو افاقہ ہو گیا، اگرچہ اکسرے سے دیکھا گیا، کہ سوئی اب قلب کے دوسرے پہلو سے نکل رہی ہے، ہفتہ میں انچ کے ایک قلیل حصہ کی رفتار سے حرکت

کرتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ پشت کی طرف بڑھی، اور آخر کار، ریڑھ کے قریب آکر رک گئی، وہاں سے وہ آسانی کے ساتھ نکال لی گئی، وہ مزدور آج بھی زندہ ہے، حالانکہ لوہے کی سوئی اس کے سینہ اور قلب کے آر پار گذر گئی تھی،

یہ صرف ایک واقعہ ہے منجملہ بہتیرے اس قسم کے عجیب وغریب واقعات کے جو ڈاکٹروں کے تجربوں میں آچکے ہیں، ابھی چند روز کی بات ہے، کہ اسی طرح کا ایک واقعہ خود میرے مشاہدے میں آیا، بعض حیثیتوں سے یہ تمام دوسرے واقعات سے زیادہ عجیب وغریب ہے، کئی سال ہوئے ایک طبیب کی بچی کے پاس کھلونے کا ایک گھوڑا تھا، جسکی ایال اصلی گھوڑوں کے بالوں کی تھی، جیسا بچوں کا قاعدہ ہے، وہ لڑکی کبھی کبھی کوئی بال توڑ کر چبایا کرتی تھی، ایک مرتبہ چباتے چباتے وہ اتفاق سے ایک بال نگل گئی، اس واقعہ پر تقریباً ۱۲ سال گذر گئے، جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو تو ایک روز اسے اپنے پیر کے ایک انگوٹھے میں کچھ خارش محسوس ہوئی، اور جلد کے نیچے پھانس کی سی کوئی چیز نظر آئی، ایک سوئی لیکر اس نے اُسے نکالنا چاہا، اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، کہ جس چیز کو وہ پھانس سمجھ رہی تھی، وہ گھوڑے کی ایال کا ایک لمبا بال تھا، جو بغیر کسی درد یا خون کے آسانی کے ساتھ نکلا ہوا چلا آرہا تھا، تقریباً بارہ سال تک یہ بال اس کے جسم کے اندر ادھر ادھر پھرتا رہا، اور بالآخر پیر کے انگوٹھے میں جاکر ٹھہر گیا تھا،

خارجی اشیاء کا گوشت کے اندر داخل ہوکر یوں ادھر ادھر پھرتے رہنا کیونکر ممکن ہے،؟ وہ کیونکر جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کرتی ہیں؟ انھیں کیا چیز حرکت میں لاتی ہے،؟ اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں،

عموماً ان چیزوں کی نقل وحرکت قدرتی راستوں سے ہوتی ہے، یعنی معدہ، رگیں اور شرائین، اور وہ راستے جن سے ہوکر ہوا پھیپھڑوں تک جاتی ہے، یہ چیزیں دوران خون کے راستوں میں بہت زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہیں، کیونکہ خون صرف نصف منٹ کی مدت میں پورے جسم کے اندر گردش کرلیتا ہے، جسم کے ٹھوس حصوں کے اندر سے گذرنے میں خارجی اشیاء بالعموم عضلات اور اعصاب کی تہوں کے درمیان سے گذر جاتی ہیں، عضلات کا سکوڑ اور پھیلاؤ، قلب کی حرکت اور وہ حرکتیں جو سانس لینے اور ہاضمہ سے پیدا ہوتی ہیں، ان چیزوں کو ادھر ادھر پھراتی

رہتی ہیں، لیکن اکثر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ یہ چیزیں اپنی نقل وحرکت میں بعض خاص طریقے کیوں اختیار کرتی ہیں، مثلاً ایک درزن کپڑا سیتے وقت منہ میں متعدد سوئیاں لئے ہوئے تھی، اسی حالت میں اسے چھینک آئی، اور ایک سوئی حلق کے نیچے چلی گئی، دس روز گذرنے کے بعد سینہ کی ہڈی کے تقریباً تین انچ نیچے جلد کے اندر سے سوئی ناکے کی طرف سے نمودار ہوئی، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکا، کہ سوئی ناکے کی طرف سے کیوں باہر آئی،

مجھے ایک دوسرا واقعہ بھی یاد ہے جس میں ایک سوئی حلق کے نیچے پہونچنے کے بعد ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہوگئی تھی، اور ہر ٹکڑا جسم کے مختلف حصوں سے نمودار ہوا، سوئی کے حلق کے اندر جانے کے ایک مہینہ بعد اس کا پہلا ٹکڑا ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے پیٹ سے نکالا، پھر چھ ہفتے بعد دوسرا ٹکڑا پیٹ کے بائیں جانب جلد کے اندر سے خود بخود باہر آیا، اور اس کے تین ہفتہ بعد بقیہ ٹکڑا جو سوئی کی نوک کا حصہ تھا، سینہ کی ہڈی کے نیچے ظاہر ہوا، سوال یہ ہے کہ وہ ٹکڑا جو سب سے زیادہ تیز تھا، سب سے زیادہ دیر میں جلد کی سطح تک کیوں پہونچا،؟

اسی قدر حیرت انگیز اور واقعات بھی ہیں، کسی دھات کا ایک ٹکڑا ایک شخص کے گھٹنے کے قریب جسم کے اندر داخل ہوگیا، اور سینہ کی جلد سے برآمد ہوا، دوسرا ٹکڑا حلق کے نیچے غائب ہوا، اور بائیں کان کی پشت پر نمودار ہوا، تیسرا منہ کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوا، اور پنڈلی کے پاس سے باہر نکلا،

تھوڑے دن ہوئے ڈاکٹر وارتھن (W. J. Warthen) نے کتوں پر اس قسم کے تجربات کئے تھے، کتوں کی رگوں میں دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے داخل کرکے وہ اکسرے کے ذریعہ سے دیکھتے تھے، کہ ان میں سے ہر ٹکڑا کہاں کہاں جاتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ تمام ٹکڑے کتوں کے قلب تک پہنچ جاتے تھے،

انسانی جسم میں بندوق کی گولی بھی کبھی یوں ہی قلب تک پہنچ جاتی ہے، چند سال ہوئے کیلی فورنیا میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، دو لڑکے خرگوش کا شکار کھیل رہے تھے، ان میں سے ایک کی بندوق

بلا ارادہ چھوٹ گئی، اور گولی دوسرے لڑکے کی ران میں جاکر لگی، ہسپتال میں ڈاکٹروں نے اکسرے سے ران کا معائنہ کیا، لیکن گولی کا کوئی نشان معلوم نہ ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد لڑکے نے قلب میں درد کی شکایت کی، پھر اکسرے کا معائنہ ہوا، تو معلوم ہوا کہ گولی خون کی نالیوں سے ہو کر قلب میں پہنچ گئی ہے، اسے وہاں سے نکالنے کے لئے ایک نہایت نازک اور خطرناک آپریشن ناگزیر تھا، جو بالآخر کامیابی کیساتھ ختم ہوا،

گذشتہ سال آسٹریلیا کا ایک لڑکا نو ہزار میل کا سفر کرکے ڈاکٹر جیکسن (C. jackson) کے پاس فلاڈلفیا پہونچا، ڈاکٹر موصوف پھیپھڑوں سے خارجی اشیاء کو نکالنے کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں، اس لڑکے کے پھیپھڑے میں ایک چھوٹی سی کیل پہونچ گئی تھی، ڈاکٹر جیکسن نے سات منٹ کے اندر اس کیل کو پھیپھڑے سے نکال دیا، اور اس آپریشن میں یہ کمال دکھایا کہ ایک قطرہ خون بھی نکلنے نہ پایا،

ڈاکٹر جیکسن کا یہ کمال تیس سال کے متواتر تجربوں کے بعد حاصل ہوا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں ہزاروں آلات ایجاد کرڈالے، تب کہیں جاکر وہ آلات تیار ہوئے، جن کی مدد سے مذکورۂ بالا آپریشن کیا گیا، ان کا ایجاد کردہ برانکوسکوپ (Bronchoscope) جو اب دنیا کے ہر حصہ میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک نلکی کی طرح ہے، جس کے سرے پر ایک چھوٹا سا برقی قمقمہ لگا ہوا ہے، یہ نلکی مریض کی حلق کے اندر ڈال دی جاتی ہے، اور پھر اس نلکی کے اندر سے لمبے اور نازک آلات جسم میں داخل کئے جاتے ہیں، جن کی مدد سے باریک سے باریک چیز بھی باہر نکالی جاسکتی ہے، وہ آلات اتنے نازک ہوتے ہیں، کہ سیفٹی پن (Safety pin.) کو بند کرسکتے ہیں، کسی دھات کے ٹکڑے کو کاٹ سکتے ہیں، موچنے کی طرح پکڑ سکتے ہیں، اور چمچہ کی طرح کسی چیز کو اٹھا سکتے ہیں،

ایکمرتبہ ڈاکٹر جیکسن نے ڈھائی منٹ کے اندر ایک پن جو شال میں لگائی جاتی ہے ایک عورت کے پھیپھڑے سے نکالی جہاں وہ بائیس سال سے پڑی ہوئی تھی، اسی طرح ایک دوسرے مریض کے پھیپھڑے سے تقریباً سات منٹ میں انھوں نے ایک پیچدار کیل نکالی تھی، جو تقریباً چالیس سال سے مستقل طور پر پھیپھڑے میں رکی ہوئی تھی، فلاڈلفیا کے ایک عجائب خانہ میں وہ تمام عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں، جنھیں ڈاکٹر جیکسن نے اپنے

مریضوں کے جسموں سے نکالا ہے، اس ذخیرہ میں مندرجۂ ذیل چیزیں شامل ہیں، جوتے کے بٹن، زنجیر کی کڑیاں، کارتوس کی ٹوپیاں، پنسل کی ٹوپیاں، پیسے، تمغے، کیلیں، مچھلی پھنسانے کے کانٹے، بالوں میں لگانے کی پنیں، اور مصنوعی دانت، چند سال ہوئے ڈاکٹر موصوف نے ایک پانچ برس کے بچے کی حلق سے پانچ کھلی ہوئی سیفٹی پنیں نکالی تھیں جو ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں، لیکن ہر ایک کی نوک مختلف سمتوں میں تھی، اپنے کام کے سلسلہ میں انھیں سینکڑوں کھلی ہوئی سیفٹی پنیں بچوں کے پھیپھڑوں سے نکالنے کا اتفاق ہوا ہے،

چند روز ہوئے کناڈا میں اکسرے کے معائنہ سے ایک ایسا حیرت انگیز انکشاف ہوا، جسکی مثال غالباً آج تک نہیں پائی گئی، ایک عورت کو مختلف دھاتوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں نگلنے کی عادت تھی، ہسپتال میں اکسرے سے اسکے پیٹ کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں انواع و اقسام کی (۲۵۳۳) چیزیں جمع ہیں، مثلاً بٹن، پنیں، سوئیاں، کیلیں، پیسے وغیرہ وغیرہ، تقریباً ایک سال سے یہ تمام چیزیں جمع ہیں، معدہ میں پڑی ہوئی تھیں، اور حیرت یہ ہے، کہ عورت کو ان سے بظاہر کوئی خاص تکلیف نہ تھی،

اس سلسلہ میں اطباء یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس قسم کی بعض چیزیں جو ایک شخص کے جسم میں پہونچ کر مہلک ثابت ہوتی ہیں، دوسرے شخص کے جسم میں کیوں بغیر کسی مضرت کے پڑی رہتی ہیں، مثلاً حال میں تیس سال کی عمر کے ایک قیدی کے متعلق یہ اطلاع موصول ہوئی ہے، کہ وہ صبح کا ناشتہ کیلوں سے کرتا ہے، اور دن کے وقت بجائے معمولی غذا کے کارتوس کھاتا ہے، اس نے بیان کیا ہے، کہ میں سات برس کی عمر سے مختلف دھات اور شیشہ کے ٹکڑے نگلنے کا عادی ہوں، اور لوگوں کے سامنے میں نے پنیں اور برقی قمقمے کھاڈالے ہیں، لیکن مجھے ان کی وجہ سے کبھی کسی درد کی شکایت نہیں ہوئی، ڈاکٹروں نے اسکے بیان کو غلط سمجھ کر اسکے معدہ اور آنتوں کا معائنہ اکسرے سے کیا، تو معلوم ہوا کہ در اصل کیلیں اور کارتوس اندر موجود ہیں، یہ چیزیں دوسرے شخص کے لئے ہلاکت کا باعث ہوتیں، لیکن غالباً اس کے جسم میں کوئی خاص بات تھی، جسکی وجہ سے اس پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا تھا،

اسی طرح بعض آدمی موچی کے سوجے، ڈبہ کھولنے کے اوزار، اور دھاگے کی گولیاں نگل گئے تھے، اور یہ سب چیزیں یا تو آپریشن کرکے نکالی گئیں، یا خود بخود فطری طور پر جسم سے خارج ہوگئیں، ایک مرتبہ ایک بچہ ریشم کے دھاگے کی ایک چھوٹی سی گولی جس میں ایک سوئی بھی تھی، گھونٹ گیا تھا، گولی تو جسم سے فطری طریقہ سے خارج ہوگئی، لیکن سوئی معدہ میں رک گئی، اور اکسرے سے دیکھنے کے بعد آپریشن کرکے نکالی گئی،

لیکن یہ ضروری نہیں ہے، کہ تمام چیزیں جو جسم کے اندر ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں، اکسرے سے نظر آجائیں، دھات کی چیزوں کے علاوہ بہتیری دوسری چیزیں بھی جسم میں داخل ہوجاتی ہیں، اور ان میں سے بعض مہینوں اور سالوں اندر نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں، اور اکسرے سے بھی معلوم نہیں ہوتیں، چنانچہ حال میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، چند لڑکے گھاس کی بالوں سے اس طرح کھیل رہے تھے، کہ ان میں سے ایک منہ کھول کر سامنے کھڑا ہو جاتا، اور دوسرے بالوں سے اس کے منہ کے اندر نشانہ لگاتے، اتفاق سے ایک بال ایک چار سال کے بچہ کے منہ میں پڑ گئی اور وہ بے اختیاری میں اُسے نگل گیا، لیکن وہ بال "غلط راستہ سے اندر پہونچی"، اور اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی، کچھ دیر کے بعد اُس بچہ کو شدید کھانسی شروع ہوئی، بخار بہت تیز آگیا، اور اس کی حالت تشویشناک ہوگئی، اس کے سینہ پر ایک جانب آماس اور سرخی نمودار ہوئی اور یہ دونوں چیزیں بڑھنے لگیں، تین ہفتے کے بعد وہ آماس خود بخود پھوٹا، اور اس میں سے گھاس کی ایک بال جو پورے پونے دو انچ لمبی تھی، باہر نکلی، یہ پھیپھڑے کی نلی کے راستہ سے اندر چلی گئی تھی، اور پھیپھڑے کے بیچ سے ہوتی ہوئی سینہ کی سطح تک پہونچی تھی، اس کے نکل جانے کے بعد بچہ کو صحت ہونے لگی، اور چند دنوں میں اصلی قوت پھر آگئی،

مندرجۂ بالا واقعات ایک عامی کی نظر میں الف لیلہ کے قصے معلوم ہوں گے، لیکن ایک طبیب کے لئے یہ واقعات تحقیق کا ایک پُراسرار میدان پیش کرتے ہیں،

"ع ز"

توسیع حیات کا امکان

امریکہ کے ایک نہایت مشہور سائنسدان ڈاکٹر شرمین (H. C. Sherman.) نے سالوں کے تجربہ کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے، کہ بعض مخصوص غذاؤں کے استعمال سے انسان زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے، یہ تجربہ دراصل خود انسانوں پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ چوہوں پر کیا گیا ہے، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ چوہوں اور انسانوں کا نظام تغذیہ بہت کچھ ملتا جلتا ہے، اور اس تجربہ کے جو نتائج چوہوں سے متعلق حاصل ہوئے ہیں، وہی انسانوں پر بھی صادق آئیں گے، یہ خیال حقیقۃً کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ مستقبل خود کر دے گا، فی الحال مضمون کی دلچسپی کا تقاضا یہ ہے، کہ اسکا خلاصہ ناظرینِ معارف کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دیا جائے،

سنہ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر شرمین نے اپنے معمل میں تجربہ کے طور پر چوہوں کے ایک خاندان کو سفید نمک، دودھ کا سفوف اور سرخ گیہوں کھلانا شروع کیا، اسوقت اس خاندان کی اولاد ترقی کرکے تقریباً (۶۵۰۰۰) کی تعداد تک پہنچ گئی ہے، اور گذشتہ اپریل میں ڈاکٹر شرمین نے امریکہ کی اکاڈیمی آف میڈیسن (ACADEMY OF MEDICINE) کے سامنے یہ اعلان کیا ہے، کہ اگر انسان اپنی غذا کے انتخاب میں دانائی برتے تو اس کی مدتِ حیات میں دس فی صدی کی توسیع ہو سکتی ہے، جیسا کہ چوہوں پر تجربہ کرنے سے ثابت ہوا ہے، یعنی انسان بجائے ستر برس زندہ رہنے کے ستتر برس تک پہونچنے کی توقع کر سکتا ہے،

توسیع حیات کے لئے ڈاکٹر موصوف نے جو اصول قائم کیا ہے، وہ بہت آسان ہے، اپنی غذا میں دودھ، ترکاریوں اور پھلوں کا تناسب زیادہ کر دیجئے، ان کے علاوہ غلہ کی چیزیں بھی کسی قدر ہوں، لیکن غلہ باریک پسا ہوا نہ ہو، گوشت اور مٹھائیوں کی بھی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ دودھ، ترکاریوں اور پھل کی مقدار کافی ہو، چوہوں پر سالوں کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا، کہ انکی غذا میں دودھ کے تناسب کا اضافہ کرنے سے ان کی مدت حیات میں بھی اضافہ ہوگیا، چونکہ چوہوں کا نظام تغذیہ انسان کے نظام تغذیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اسلئے

بھی توقع انسان کی زندگی سے متعلق بھی کیجا سکتی ہے، اور اہلِ سائنس کو اس نظریہ کی صحت میں کوئی شبہہ نہیں ہے ایک چوہے پر غذا کا تجربہ تین سالوں میں مکمل ہوتا ہے، اسکی مدتِ حیات اوسطًا انسانی زندگی کا تیسوان حصہ ہوتی ہے، اس اعتبار سے تین سال کی عمر کا چوہا تقریبًا ویسا ہی کمیاب ہے، جیسا نوے سال کی عمر کا انسان ڈاکٹر شرمین نے دو ہزار چوہوں پر ان کی پیدائش سے لیکر موت تک تجربہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ مخصوص غذا کے استعمال سے انسان کی عمر میں بھی سات سال کا اضافہ ہو سکتا ہے، ان کا بیان ہے:۔

عام طور پر غذا میں دودھ کا تناسب بڑھا دینے سے زندگی کی مدت بڑھ جانی چاہیئے، اکثر ممالک میں جنیں ہمارا ملک بھی شامل ہے، غلہ لوگوں کی غذا کا سب سے بڑا جزو ہے، اگر غلہ کی ایک معتدل مقدار کھائی جائے، لیکن اس طرح کہ غلہ باریک پسا ہوا نہ ہو، بلکہ برائے نام پسا ہوا ہو، تو اس سے عمومًا فاسفورس، لوہے، تانبے، مینگنیز اور وٹامن بی اور ای کی ایک بڑی مقدار جسم میں پہونچے گی، لیکن اگر غذا میں دودھ پھل، ترکاریوں، اور انڈوں کا تناسب زیادہ کر دیا جائے، تو جسم میں کالسیم، اور وٹامن، اے، سی، اور جی کی مقدار بڑھے گی، اور یہ اجزا زیادہ اہم ہیں"

ل ڈ "ع ز"

لغاتِ جدیدہ کا نیا اڈیشن

لغاتِ جدیدہ پہلے پہل ۱۹۱۰ء میں چھپی تھی، اور ملک کے عربی خوان حلقہ میں بہت مقبول ہوئی، یہ اسکا تیسرا اڈیشن ہے، جس میں جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک جو سینکڑوں، ہزاروں نئے الفاظ، اور اصطلاحات عربی زبان میں پیدا ہو گئے ہیں، وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں، اور اس طرح سے یہ موجودہ عہد تک کے تمام جدید عربی الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری بن گئی ہے، شروع میں "عربی کے جدید الفاظ و تراکیب" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی ہے، جسکو مولوی مسعود عالم صاحب ندوی مدیر الضیاء نے مرتب کیا ہے، جدید اڈیشن کی تیاری میں موصوف کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، حجم ۳۰۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

آبِ ثقیل کی خصوصیت

اڈنبرا یونیورسٹی (اسکاٹ لینڈ) کے ڈاکٹر جیمس کنڈال (G. E. Kendall.) نے اعلان کیا ہے "کہ آبِ ثقیل کے استعمال سے انسانی زندگی میں دس سال کا اضافہ ہو سکتا ہے، "آبِ ثقیل" کی دریافت کو صرف چھ سال گذرے ہیں، کیمیاوی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے، کہ معمولی پانی کے چھ ہزار حصوں میں ایک حصہ "آبِ ثقیل" کا ہوتا ہے، جو دیکھنے میں معمولی ہی پانی کا سا معلوم ہوتا ہے، لیکن اور باتوں میں معمولی پانی سے مختلف ہوتا ہے، آبِ ثقیل کے دس گلاس معمولی پانی کے گیارہ گلاسوں سے وزن میں زیادہ ہوتے ہیں، معمولی پانی کی بہ نسبت آبِ ثقیل میں تین درجہ زاید ٹمپریچر پر اُبال آتا ہے، اور سات درجہ زائد ٹمپریچر پر وہ منجمد ہوتا ہے، معمولی پانی میں کوئی ذائقہ نہیں ہوتا، آبِ ثقیل میں ایک خفیف شیرینی ہوتی ہے،

آبِ ثقیل کی دریافت کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ آبِ حیات ثابت ہوگا، یا زہر ہلاہل، یا ویسا ہی جیسا معمولی پانی، بعض تجربہ کرنے والوں نے اسکی قلیل مقدار پی، لیکن انھیں کوئی مضرت نہیں پہونچی، لیکن چوہوں کو جب اسکی مقدار نسبتًہ زیادہ دی گئی، تو وہ مر گئے، اسی طرح جب مینڈکوں اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو آبِ ثقیل میں ڈالا گیا، تو وہ مر گئیں، ابھی تک متعین طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ چیزیں "آبِ ثقیل" سے مرکیوں گئیں، لیکن ماہرینِ کیمیا کی سمجھ میں ایک اہم اشارہ آگیا ہے، انھوں نے دورانِ تجربہ میں دیکھا ہے کہ بہت سے کیمیاوی ردِعمل "آبِ ثقیل" میں بہ نسبت معمولی پانی کے زیادہ آہستہ آہستہ واقع ہوتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آبِ ثقیل رفتارِ حیات

میں سستی پیدا کر دیتا ہے، یہی چیز ڈاکٹر کنڈال کے نظریہ کی بنیاد ہے، ان کا خیال ہے، کہ اگر "آب ثقیل" کی مناسب مقدار احتیاط کیساتھ استعمال کیجائے تو بہت ممکن ہے کہ جسم انسانی کی مشین کی رفتار کم ہوجائے، اور انسان زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکے، اس مشین کی رفتار کی سستی دماغ پر بھی اثر ڈالے گی، اور جوان عمر لوگ اپنی قوت عمل میں کمزوری محسوس کریں گے، لیکن بوڑھوں کے لئے جو زندگی کی کشمکش سے علحدہ ہوکر اپنی بقیہ مدت حیات سکون کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں، آب ثقیل کا یہ اثر یقیناً مفید ثابت ہوگا، ڈاکٹر موصوف کو امید ہے کہ دس پندرہ برس میں آب ثقیل کا استعمال بوڑھوں میں عام ہوجائے گا، اسوقت سب سے بڑی دقت اسکے استعمال میں یہ ہے، کہ یہ ایک نہایت قیمتی چیز ہے، پہلے ایک چمچہ آب ثقیل کی قیمت تین سو ڈالر تھی، اور آج بھی تین سو ڈالر میں صرف دو گلاس پانی خریدا جاسکتا ہے، موجودہ نرخ سے اگر سال بھر کے استعمال کے لئے کوئی شخص اسے خریدنا چاہے، تو ایک کروڑپتی بھی دیوالیہ ہوجائے گا، اسکے اس درجہ گراں قیمت ہونے کی وجہ یہ ہے، کہ مخصوص کیمیاوی طریقہ سے اسکے نکالنے میں مصارف بہت ہوتے ہیں، لیکن ڈاکٹر کنڈال کا خیال ہے کہ چند سالوں میں یہ مشکل بھی حل ہوجائے گی، اور قدیم کیمیا گروں کا "آب حیات" سستے داموں بکنے لگے گا،

امریکہ میں بے پڑھے لکھوں کی تعداد

حال میں ولیم اسمتھ (W. Smith) صدر محکمۂ تعلیم بالغان نیویارک اسٹیٹ کے ایک بیان سے امریکہ کے اکثر باشندوں کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ان کا ملک پڑھے لکھوں کے تناسب کے لحاظ سے دنیا کے ہر ملک سے بڑھا ہوا نہیں ہے، مثلاً فنلینڈ (Finland) کے ہر اس شخص کے مقابلہ میں جو اپنی زبان میں لکھ نہیں سکتا، چھ امریکن ایسے ملیں گے جو اپنے دستخط بھی نہیں کرسکتے، ایسے لوگوں کی تعداد بھی جو مطبوعہ عبارت سے بمشکل مطلب نکال لیتے ہیں، توقع سے زیادہ نکلی، ماہرین کی ایک جماعت نے ان کی استعداد کا باقاعدہ طور پر امتحان لینے کے بعد جو معلومات حاصل کئے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں، گذشتہ سال امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسہ میں یہ تخمینہ پیش کیا گیا تھا کہ ملک

کی نصف آبادی اتنی استعداد نہیں رکھتی، کہ کسی مطبوعہ صفحہ کا مفہوم پوری طرح سمجھ سکے، اور حال میں شکاگو یونیورسٹی کے صدر نے اندازہ لگایا ہے کہ ملک کے نصف نوجوانوں میں جن کی عمریں سولہ اور بیس سال کے درمیان ہیں، اتنی قابلیت نہیں ہے، کہ وہ بطور خود کتابوں سے کوئی تعلیم حاصل کرسکیں ماہرین کے ان تخمینوں کی بناپر کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ کے پانچ کروڑ باشندے صرف تھوڑا بہت لکھے پڑھے ہیں لیکن ولیم اسمتھ نے اپنے محکمہ کے نمایندے کی حیثیت سے یہ پیشینگوئی کی ہے، کہ سنہ ۱۹۵۰ء تک نیویارک اسٹیٹ میں ایک شخص بھی ان پڑھ رہ نہ جائے گا، اونھوں نے اس پیشینگوئی کی تائید میں بیان کیا ہے، کہ اس ریاست میں سنہ ۱۹۲۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۰ء تک بے پڑھے لکھوں کا تناسب (۵،۱) فی صدی سے گھٹ کر (۳،۷) فی صدی تک آگیا ہے،

یورپ میں مسلمانوں کی تعداد

ذیل کے اعداد وشمار ڈاکٹر ذکی علی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں جو انگریزی رسالہ اسلام لاہور کی قریبی اشاعت میں نکلا ہے،

مشرقی اور جنوبی مشرقی یورپ،

البانیا میں (۷۰) فی صدی سے زیادہ مسلمان ہیں، جن کی مجموعی تعداد (۷۵۰۰۰۰) ہے،

یوگوسلاویا،	تقریباً	(۱۷۵۰۰۰)
بلغاریا،	"	(۷۸۹۲۹۶)
رومانیا،	سنہ ۱۹۳۴ء میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ (۲۳۰۰۰۰) تھا،	
یونان	سنہ ۱۹۲۸ء میں انکی تعداد تخمیناً (۱۸۰۰۰۰) تھی،	
پولینڈ اور لتھوانیا،	تقریباً	(۱۲۰۰۰)
فن لینڈ	"	(۳۰۰۰)

ہنگری	تقریباً	(۳۰۰۰)
مغربی یورپ :-		
فرانس	تقریباً	(۲۰۰۰۰)
برطانیہ عظمیٰ	"	(۳۰۰۰۰)
بلجیم	۱۹۲۹ء کی مردم شماری کے مطابق،	(۵۰۰۰)
ہالینڈ اور جرمنی،		(۶۰۰۰)
اٹلی		(۱۵۰۰)
اسپین	تقریباً	(۵۰۰۰)
سائپرس	۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق	(۶۴۲۳۸)
روڈس	تقریباً	(۱۲۵۰۰)

پھلوں کی جانچ کا برقی آلہ

امریکہ میں ایک برقی مشین ایجاد کی گئی ہے، جو بتادیتی ہے کہ پھلوں کی اندرونی حالت کیسی ہے، جن پھلوں کا چھلکا دبیز ہوتا ہے، مثلاً چکوترے انکی اندرونی حالت کا صحیح اندازہ مشکل سے ہوتا ہے، اور اکثر باہر کے تاجروں کو مال کی خرابی کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے، اس مشین کی ایجاد سے یہ شکایت رفع ہوجائے گی، کیونکہ اب باہر بھیجنے سے پہلے تمام پھل جانچ لئے جائیں گے، اگر کسی پھل میں کچھ بھی خرابی ہوئی، تو اس مشین میں ڈالنے کے بعد چھلکے پر فوراً داغ پڑجائیں گے، اور یہ داغدار پھل اچھے پھلوں سے خودبخود علحدہ ہوجائے گا، یہ مشین ایک دن میں ہزاروں پھلوں کی جانچ کرلیتی ہے۔

"ع ز"

مطبوعات جدیدہ

پستالوزی، مؤلفہ جناب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۱۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ مجلد، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

جان ہنرش پستالوزی اٹھارہویں صدی کا مشہور جرمن مفکر ہے، ایسے ماحول اور ایسے عہد میں اسکی نشوونما ہوئی جب سارا یورپ انقلابی دور سے گذر رہا تھا، اور ایک نئے دور کی تعمیر ہورہی تھی، اس پرآشوب زمانہ میں پستالوزی نے اپنی قوم کی صحیح تعمیر کے لئے مذہب اخلاق، تہذیب معاشرت اور تعلیم وغیرہ متمدن انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق خواہ وہ مادی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں یا اخلاقی و روحانی سے مذہب اخلاق میں سموئے ہوئے نظریے یا نظام العمل پیش کیا، اور ان میں سے بعضوں پر عمل کرکے بھی دکھا دیا، ان خیالات نے یورپ میں بڑا اثر ڈالا، لائق مؤلف نے ان تمام خیالات اور نظام العمل کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا ہے، پستالوزی اگرچہ ایک مغربی فلسفی ہے، لیکن اس کا دل انسانی ہمدردی اور اخلاق و روحانیت میں ڈوبا ہوا ہے جس کے پرتو سے اس کا کوئی خیال اور کوئی عمل خالی نہیں، آج کل ہندوستان بھی ایک ایسے دور سے گذر رہا ہے، جس میں قدیم اور جدید خیالات میں کشمکش جاری ہے، اور وہ بیشتر مسائل اس کے سامنے بھی ہیں، جن کے متعلق پستالوزی نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں، اس لئے ان نئے رجحانات اور جدید مسائل میں ان خیالات سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے، کتاب کا انداز بیان نہایت سلجھا ہوا ہے، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے،

آصف نامہ: مصنفہ جناب محمد حبیب اللہ صاحب، وفا، مددگار فوقانیہ عثمانیہ حیدرآباد تقطیع اوسط ضخامت ۸۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

مولوی حبیب اللہ صاحب وفا حیدرآباد کے مشہور شعراء میں ہیں، انھوں نے سات جلدوں میں دولت آصفیہ کی پوری تاریخ نظم کرنے کا عزم کیا ہے، یا کر چکے ہیں، آصف نامہ اس کا آخری حصہ ہے، اس میں عہدِ عثمانی کے اہم واقعات، اور سیاسی، علمی، تمدنی، صنعتی اور تعمیری ترقیوں کو دکھایا گیا ہے، مسلسل تاریخ اور متنوع واقعات کا نظم کرنا بڑا دشوار کام ہے، لائق مصنف نے بڑی حد تک کامیابی کیساتھ اس مرحلے کو طے کرنیکی کوشش کی ہے، پھر بھی بیان میں بہت نشیب و فراز ہے، تکمیل کے بعد یہ منظوم تاریخ ایک دلچسپ چیز ہوگی،

میدانِ عمل، از منشی پریم چند تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۹۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، غالباً دو روپیہ تک ہوگی، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

یہ منشی پریم چند آنجہانی کا اصلاحی ناول ہے، جس میں ہندو مسلم اتحاد، آزادی وطن، کسانوں کی ہمدردی، دیہاتوں اور پسماندہ طبقوں کی اصلاح، اچھوت ادھار، سرمایہ داری کی مخالفت، فرسودہ رسوم کی اصلاح، قوم و ملک کیلئے سرفروشی وغیرہ، تمام مسائل کو جو ہندوستانیوں کے سامنے عموماً اور ہندو سوسائٹی کے سامنے خصوصاً درپیش ہیں، افسانہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، ضمناً حکومت کی قوت کے بیجا مظاہر، جیل کی زندگی اور اس قبیل کے دوسرے حالات بھی آگئے ہیں، بقدر چاشنی مسلمانوں کی شرکت بھی نظر آتی ہے،

یادِ انوار مولفہ جناب محمد امین صاحب زبیری سابق مہتمم تاریخ بھوپال تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، مصنف سے علیگڈھ سے ملیگی،

حاجی انوار احمد صاحب مرحوم آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر تھے، انھوں نے قریب قریب اپنی ساری عمر کانفرنس کی خدمت میں گذار دی، وہ محض تنخواہ دار سفیر نہ تھے، بلکہ ایک حالات زمانہ سے باخبر مسلمانوں کی ضروریات سے واقف مسلمان، اس سے بڑھکر وہ قوم کے دردمند بیچے اور مخلص خادم تھے، اگرچہ وہ عرفی معنوں میں بڑے آدمی نہ تھے لیکن ان کی ذات میں غیر معمولی اوصاف و کمالات جمع تھے، جس سے انھوں نے کانفرنس کو بڑا فائدہ پہنچایا، محمد امین صاحب نے انکے حالات لکھ کر نہ صرف ایک مخلص خادم قوم کی قدردانی کا حق ادا کیا، بلکہ مسلمانوں کے سامنے ایک نمونۂ عمل کی قلمی تصویر پیش کردی

"م"